"احساس" رکھتا ہے، کچھ محسوس کرسکتا ہے وہ اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ کیونکہ زندگی میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تھوڑی دیر ہی کے لئے سہی ہم اس جذبے کی تلخی ضرور محسوس کرتے ہیں۔ "الاؤ" صرف محبت کی کہانی نہیں، معاشرتی المیہ بھی ہے۔ ایسے المیے ہمارے سفید پوش گھرانوں میں آپ کو دکھائی بھی دیتے ہوں گے کیونکہ ادیب جو بھی لکھتا ہے وہ اس کی ذہنی اختراع ہی سہی بہرحال معاشرے ہی سے کشید کی جاتی ہے۔

راتوں رات کایا پلٹ جانے کی ہوس میں مبتلا لوگ جو شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں وہ انہیں بالآخر ذلت و بربادی کی ایسی شاہراہ پر گامزن کر دیتے ہیں جس کا اختتام تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ انسان یہ سب کچھ جاننے کے باوجود یہ سب کچھ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس سعیٔ لاحاصل کا انجام جانتے ہوئے بھی اس آگ کا ایندھن بننے کی ذھن اس پر سوار رہتی ہے۔ کیسا مجموعہ اضداد ہے یہ انسان بھی!!

طارق اسمٰعیل ساگر

(O)(O)(O)(O)

میرا نام نجمہ ہے   ! مجھے پہچان لیجئے۔

آج میں اپنے ماضی کے موہنجوداڑو پر بیٹھی اپنی منتشر ذات کی کرچیوں کو جمع کر رہی ہوں اور مستقبل میرے سامنے زہریلے ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا ہے تو میرے ذہن میں رہ رہ کر ایک سوال سر اٹھاتا ہے کہ میری تخلیق کے بغیر کارخانۂ قدرت کے نظام میں آخر کیا کمی رہ جاتی؟ میری ماں مجھے بتایا کرتی تھی کہ میں وقت پیدائش مرتے مرتے بچی تھی اور یہی میرا سب سے بڑا المیہ ہے   جی ہاں! مانئے بعض لوگوں کا زندہ رہ جانا بہت بڑا المیہ بن جاتا ہے جیسے بعض لوگوں کا مر جانا۔

یہ جو مر مر کے جینا ہوتا ہے نا   اس سے ایک دفعہ مر جانا بہتر نہیں ہوتا کیا؟.....!

میں وہ ناگن ہوں جو سب سے پہلے خود اپنے زہر کا شکار ہوئی۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو ڈس لیا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے یہ سب کچھ۔ آج جب موت کی شاہراہ پر کھڑی میں آپ سے مخاطب ہوں تو اصل میں میں آپ کو یہی بتانے جا رہی ہوں کہ سانپ بھی اپنے نوزائیدہ بچوں کو نہیں کاٹتا۔ انسان بھی اپنے آپ کو ڈس لیتا اور شیطان بن کر اپنی ذات میں زندہ رہتا ہے۔

ایک مرتبہ نوید نے مجھے کہا تھا   "تمہارا انجام اتنا بھیانک ہوگا کہ اس کے ذکر

urdufans.com

سے تم پر لرزہ طاری ہو جائے۔ تم مردگی نہیں۔ زندگی کا جہنم بھگتنے کے لئے تمہاری مر لبی ہوتی چلی جائے گی۔ تم چلا چلا کر موت مانگو گی اور موت تم سے منہ موڑ لے گی"۔

آج میں رو رو کر موت کی التجائیں کرتی ہوں نہیں آتی اچھا ہے۔ اس لئے کہ میں مرجاتی تو یہ کہانی آپ کو کون سناتا؟

میرا جنم ایک نیم مذہبی نیم دیہاتی گھرانے میں ہوا۔ میرے گاؤں کو مضافاتی علاقہ کہہ لیجئے۔ شعور کی آنکھ کھلی تو والد کو ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کرتے پایا۔ وہ ٹرین پر دفتر جایا کرتے اور واپس آیا کرتے تھے۔ آٹھویں جماعت تک میں نے تعلیم گاؤں کے سکول میں ہی حاصل کی تھی۔ پھر ایکا یک ایک روز ہمارے والد نے ہماری گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کا اعلان کر کے ساری برادری کو شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔

"نیاز محمد! عقل کر' کیوں ماں باپ کی جنم بھومی چھوڑ کر شہر جا رہا ہے۔ اللہ رکھے یہاں تجھے کس شے کی کمی ہے۔ گھر بار' ڈھور ڈنگر' کیا نہیں ہے تیرے پاس' کیوں ناشکرا ہوتا ہے تو"

میرے تایا جی نے والد کو سمجھایا۔

"بھائی جی! اپنے معاملات میں خود زیادہ بہتر سمجھتا ہوں"۔

انہوں نے تایا جی کو ایک ہی جواب سے لاجواب کر دیا۔

"بیٹا! اس دن کو پچھتائے گا۔ باز رہ"

دادا ابا بولے۔

"جب میں آپ کے پاس مانگنے آؤں گا تو آپ انکار کر دیں مجھے کچھ دینے سے"

والد نے ان کی سفید داڑھی کی شرم بھی نہ رکھی۔

"کمال ہے اب ہمیں اپنی برائی بھلائی سوچنے کا حق ہی نہیں"

امی' جنہیں اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ان کی تو دیرینہ خواہش بر آئی تھی' قریب ہی سے بولیں۔

"بنی! ہوش کر۔ کیوں تم لوگ اپنی بربادی پر تلے بیٹھے ہو"

دادا ابو نے انہیں سمجھانا چاہا۔

جواب میں امی نے حسب معمول انہیں وہ بے نقط سنائیں کہ بیچارے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ والد صاحب اس دوران میں کان اور آنکھیں بند کئے وہاں موجود رہے۔ یہ اُن کی عادت تھی کہ امی کی کسی بدزبانی کا بھی نوٹس نہیں لیا کرتے تھے۔

"خدا جانے ان لوگوں کو ہم سے کیوں اتنی دشمنی ہے۔ بھئی میری مرضی میں چاہے جہنم میں جاؤں۔ اپنا برا بھلا میں نے سوچنا ہے۔ انہیں کیا چنیدہ بناؤں گا"۔

ان کے جاتے ہی والد اونچی آواز میں بولنے لگے۔ وہ امی کے حکم پر ہمیں شہری بنانا چاہتے تھے۔

"نیاز محمد! اب سمجھ آ گئی۔ اب تو تو نے اپنے کانوں سے سن لیا سب کچھ۔ میں نہ کہتی تھی' یہاں میرا گزارہ نہیں۔ میرا خدا جانتا ہے جس طرح میرے دن یہاں گزرے ہیں"۔

امی موقع ہاتھ سے خالی کیوں نہیں جانے دیتیں۔

"میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں زہراں! سب سمجھتا ہوں۔ آج تک بڑوں کے احترام میں چپ رہا ہوں"۔

والد نے گوہر فشانی کی۔ اور امی نے ہماری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ سب کچھ اُن کی خواہشات کے مطابق ہو رہا تھا۔

urdufans.com

"ماں"۔ کتنا تقدس ہے اس لفظ میں۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ بعض مائیں ڈائن بن جاتی ہیں۔ جی ہاں ڈائن جو اپنے ہی بچوں کو کھانے پر تل جاتی ہیں۔

زندگی نے مجھے بہت کچھ لکھا پڑھا دیا ہے۔ تجربے سے میں نے بڑا گیان حاصل کیا ہے۔ میں جانتی ہوں عورت تخلیق کرتی ہے۔ یہ خدائی صفت ہے۔ لیکن جب خالق ہی اپنی تخلیق کو ڈس لے۔ اس کی رگوں میں خون کی بجائے زہر بھر دے پھر اسے کیا کہا جائے؟

میں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے دادا ابو دادی مرحومہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے لڑتے جھگڑتے دیکھا ہے۔ خدا جانے وہ کون سی بدقسمت گھڑی تھی جب میرے والد کی آنکھ اُس سے لڑی اور آپس کے تعلقات کا نتیجہ شادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ شادی میرے والد نے سارے خاندان کی مخالفت مول لے کر کی تھی۔

اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ لوگ خاندان سے باہر یا اپنی مرضی کی شادی کے مخالف تھے۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ میرے تایا ابو میری امی کے خاندان سے واقف تھے۔ ایسے "مہذب آبرو باختہ" گھرانے بڑے شہروں میں عموماً پائے جاتے ہیں جو اپنے ماتھے پر شرافت کا لیبل لگا کر اندرون خانہ ہر بے حیائی روا رکھتے ہیں۔

میری ماں کا تعلق بھی ایک ایسے ہی "مہذب" گھرانے سے تھا اور ہماری بدقسمتی کہ ابو سے وہ اچانک ٹکرا گئیں۔ والد ایسے سرکاری محکمے میں ملازم تھے جہاں زیادہ تر عوام سے واسطہ رہتا تھا۔ پہلی ہی نظر میں امی نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ "آدمی کام کا ہے"۔ ان کی پکڑ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ پھر کبھی والد اس شکنجے سے نہ نکل سکے۔

دیہاتیوں کو عموماً بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ خدا جانے اس میں حقیقت کتنی ہے لیکن میرے والد صاحب بیوقوف تھے کہ والدہ کی خواہشوں کے سامنے سر جھکاتے ہی چلے گئے۔ شادی کے فوراً بعد انہوں نے "رشوت" لینی شروع کر دی تھی۔

یہ نیک مشورہ بھی والدہ ہی نے انہیں دیا تھا جس پر والد صاحب نے آنکھیں بند کر کے عمل کیا اور اپنی خاندانی شرافت کو داؤ پر لگا کر جی جان سے اس دھندے سے لو لگا لی۔ جب حرام گھر میں آنے لگا تو حلال کھانے والوں کو ناگوار گزرا۔ انہوں نے والد کو سمجھانا چاہا اور امی کی دشمنی مول لے لی۔ امی کے لئے حلال حرام کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے انہیں صرف پیسہ چاہئے تھا۔ وہ جیسے بھی اور جہاں سے بھی آئے اور یہی فلسفہ انہوں نے ابو کے دل و دماغ میں ٹھونس رکھا تھا۔

کہنے والے کہتے تھے کہ میری دادی بیٹے کے غم میں مر گئی تھیں۔ وہ بے چاری سیدھی سادی اگلے زمانے کی عورت تھی۔ بیٹے کے کرتوت ان کے علم میں آئے تو پہلے اسے زبان سے سمجھاتی رہیں۔ پھر ناراضی کا اظہار کیا اور جب کسی طرح بھی بیٹا راہ راست پر نہ آیا تو اپنی شکست تسلیم کر لی اور ایک روز چپ چاپ آنکھیں موند کر جو سوئیں تو پھر کبھی نہ اٹھیں۔

سارا محلہ اُن کی موت پر سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ جانے کتنوں کے لئے وہ ابر رحمت تھیں، جانے کتنے تھے جو اُن کے سائے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک تھی۔

میری پرورش بچپن میں میری دادی نے کی تھی۔ اس میں ذرا سا مبالغہ نہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا اور امی کی ناراضی مول لے کر میری پرورش پرداخت کرتی رہیں۔ ان کی مہربانی ہی سے میں گھر پر قرآن پاک پڑھ گئی۔ اگر معاملہ امی کے ہاتھ میں ہوتا تو میں بہت دیر بعد جو کچھ بنی وہ بہت پہلے ہی بن چکی ہوتی۔

یہ میری دادی کی ذات تھی جو میری ماں کی پھیلائی برائی اور میرے والد کے درمیان اتنے طویل عرصے تک دیوار بنی رہی۔ ان کی زندگی میں معاملہ والد کے رشوت لینے

urdufans.com

تک ہی رہا۔ دادی کے مرتے ہی امی کو اپنے برسوں پہلے دیکھے خواب حقیقت بنتے دکھائی دیئے اور ان کی دلی مراد بر آئی۔ اُن کے دیرینہ عزائم اور ہمارے درمیان اگر کوئی دیوار تھی تو وہ ہماری دادی اماں تھیں۔ جیسے ہی وہ اُٹھیں امی کے شیطانی منصوبے بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔

دادی کے مرتے ہی امی نے فوراً اپنے منصوبے پر عمل کیا اور اس کا آغاز پانچوں وقت نماز پڑھنے سے ہوا۔ دادی کی زندگی میں انہوں نے کبھی دادی کو تعظیم سے بلانا گوارا نہ کیا۔ ان کی پیٹھ پیچھے جہاں موقع ملا ان کی برائی کی' لیکن ان کے فوت ہوتے ہی ان کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔ امی کے رویے کی اس تبدیلی نے سب کو حیران کر دیا۔

اصل میں یہ سب کچھ اس منصوبے کا حصہ تھا جس پر امی عمل پیرا ہونے جا رہی تھیں۔ میری پیدائش کے دو سال بعد چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ والدہ نے ابو کے دل میں یہ بات بٹھانی شروع کی کہ یہاں دیہات میں رہ کر ہم لڑکیوں کو جہنم میں جھونکنے کے علاوہ اور کیا کارنامہ انجام دیں گے۔ اپنے حصے کی جائیداد کے پیسے لو اور شہر میں مکان بنا لو۔ نہ یہاں رہیں گے نہ بچیوں کی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔ امی کا تعلق چونکہ شہر سے تھا اور انہوں نے ابو کے ساتھ شادی کے بجائے سرمایہ کاری کی تھی۔ اب حساب کتاب چکانے کا وقت آ چکا تھا۔

جس روز والد نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ وہ گھر جس میں میں نے جنم لیا میرے خون میں رچ بس گیا تھا۔ یہاں سے میں جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب کبھی ایک آدھ دن مجھے شہر جا کر ننھیال میں رہنا پڑتا میں مصیبت میں پھنس جاتی اور اپنی نانی سے بضد ہوتی کہ مجھے واپس گھر پہنچاؤ۔ اس کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں تھی کہ ہمیں شہر سے وحشت تھی بلکہ امی کا خاندان تھا۔ جہاں کھلے بندوں ایسی اخلاق سوز گفتگو اور

حرکات کی جاتی تھیں جن کا میں عام حالات میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی بات آئی کہ امی یہ سب کچھ صرف ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے کر رہی ہیں کیونکہ ان کے 'شہری مزاج' کی وجہ سے کبھی ان کی کسی سے نہ بن سکی' بلکہ دادی کی زندگی کے آخری ایام میں تو یہ نوبت آ گئی کہ کوئی امی کے منہ لگنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

ہمارے ہاں ہمارا ایک ماموں اکثر آتا رہتا تھا۔ دادی کی وفات پر جب وہ آیا تو اس کے ساتھ ایک ''پیر صاحب'' بھی تھے جس کا تعارف اس نے ہمارے گھر والوں سے ''اپنے مرشد'' کی حیثیت سے کروایا تھا۔ پہلے ہی روز مجھے اس شخص میں چھپی خباثت اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جھانکتی نظر آ گئی تھی۔ اس کے بعد ان پیر صاحب کا آنا جانا اکثر ہمارے گھر لگا رہتا تھا۔ یہ دادی مرحومہ کی تربیت کا فیض تھا پہلے ہی روز سے یہ نام نہاد پیر میری نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔

والد کو اس نے دو چار کرشمے دکھا کر اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کے تعویزوں کی برکت سے والد صاحب ایک دو مرتبہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچے تھے جس کے بعد سے تو وہ بس پیر صاحب ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔

جس روز والد نے امی کے گاؤں بدر ہونے کے فیصلے پر صاد کیا اس روز میں نے ماں کو پیر صاحب کے پاؤں چھوتے دیکھا۔

''میاں جی! آپ کے تعویزوں کی برکت سے آج میرا سویا مقدر جاگا ہے''۔ انہوں نے بڑی عقیدت سے دودھ کا گلاس پیر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں نجانے کیوں وہاں چھپ کر کھڑی تھی۔ اس لمحے میرے لاشعور میں کیا تھا۔ میں آج تک سمجھ نہیں پائی۔ شاید کوئی وسوسہ' کوئی وہم' شک یا پھر وہ خوف جس کی تصدیق

urdufans.com

کرنے کے لئے میں نے یہ غیر اخلاقی حرکت کی تھی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔

اس روز مجھے علم ہوا کہ میری والدہ اس بد معاش پیر سے الٹے سیدھے تعویز لے کر ابو کو پلاتی رہی ہے۔ یہ میرے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کیونکہ ایسے واقعات ہمارے دیہاتوں میں آئے روز سننے دیکھنے کو ملتے رہتے تھے۔

ہم بھی خاصے ضعیف العقیدہ لوگ تھے اور ایسے نام نہاد پیروں کا شکار رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے اس پیر پر شک نہ کیا۔ بلکہ اس کی خدمت میں ہی جتے رہے یقین مانیے اس روز مجھے اپنی ماں کے رویے سے اُلجھن ہونے لگی۔ نجانے وہ ابو کو کیسے تعویز پلا رہی تھی۔

شاید اس وقت میں کھل کر اس بات کا اظہار نہ کر پائی۔ ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی جس کی پرورش دیہاتی اور مذہبی قسم کے ماحول میں ہوئی ہو کبھی ایسی گھٹیا سوچ کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن اس روز کسی نادیدہ ہستی نے چپکے سے میرے کانوں میں کہا کہ یہ ماں نہیں صرف عورت ہے۔ عورت!

اور جب عورت اپنے تقدس مآب رشتوں سے ناطہ توڑ کر صرف عورت بنی رہے تو وہ ''خطرناک عورت'' بن جاتی ہے۔ جی ہاں! ایسی عورت جس پر دنیا کے تمام مذاہب شک کرتے ہیں۔ جو باعث فساد کہلاتی ہے۔ اپنی ماں کے متعلق کئے گئے اس فیصلے کو شاید میرے شعور نے اس وقت تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ تو آپ جان ہی گئے ہوں گے۔

جی ہاں! میری دادی مرحومہ کی تربیت جنہوں نے مجھے بہت عرصہ پہلے یہ سکھا اور سمجھا دیا تھا کہ والدین کا ہر صورت احترام کرنا ہے۔ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ خبردار! کبھی ان کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولنا۔ اور میں نے اپنی دادی کی بات کو حرز جان بنا لیا تھا۔

جب والد کسی طرح اپنا فیصلہ بدلنے پر رضامند نہ ہوئے اور بضد رہے کہ انہیں

ان کے حصے کی جائیداد بیچنے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ ہماری موروثی جائیداد تھی تو میرے والد سے زیادہ اس کی قانونی حیثیت اور کون جان سکتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بادل نخواستہ ہی سہی دادا جان یہ مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ دادا نے ان کے حصے کی زمین کی قیمت اس وقت انہیں ادا کر دی لیکن ساتھ ہی کہہ دیا کہ ''نیاز محمد! آج سے تم ہمارے لئے مر گئے''۔

☆☆☆

میرے دادا اپنے قول کے پکے تھے۔ مرتے دم تک والد کو منہ نہ لگایا اور مرتے وقت وصیت کر دی کہ نیاز محمد میرے جنازے کو ہاتھ نہ لگائے۔ ان کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح؟ اس کا فیصلہ تو میں نہیں کر پائی لیکن ان کے صدق کو سلام کہ اپنے قول سے نہ پھرے۔

ماموں نے شہر میں مکان ہمارے لئے پہلے ہی سے تاڑ رکھا تھا۔ یہ ہمارے ننھیال کے محلے ہی کا ایک خالی مکان تھا جو امی کے لئے ان لوگوں نے کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔

جس روز میں دادا سے جدا ہوئی میرا کلیجہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں سسکیاں لے کر رو رہی تھی اور امی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات کی شاکی رہیں کہ میں ننھیال کے بجائے ددھیال کے نزدیک ہوں۔

انہوں نے مجھ روتی بلکتی کو کھینچ کر دادا سے الگ کیا اور ابو کے دفتر کی اس ویگن میں دھکیل دیا جو ہمیں لے جانے آئی تھی۔ اپنے پیاروں سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد حالات نے پھر کبھی مجھے ان سے ملنے نہ دیا۔ کبھی کبھی سرسری ملاقات ہو جاتی تو بھی امی کا موڈ خراب رہتا۔

امی نے ابو کے حصے کا سارا پیسہ مکان کی زیبائش کی نذر کر دیا اور بالآخر ہمارا گھر سجاوٹ کے لحاظ سے اس محلہ کے چیدہ چیدہ مکانوں میں شامل ہو چکا تھا۔ لیکن امی جانتی

urdufans.com

نیا مکان خرید لیں۔ ہم تو کرائے کے گھر
تھیں۔ حالانکہ ابو کی خواہش تھی کہ ہم اس رقم سے
میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

آدمی آگے ہی آگے بڑھنا چاہتا ہے اور وہ
شہر کی زندگی کے اپنے تقاضے ہیں۔
والدہ صاحبہ کی نمازیں کم
لوگ جو یہ منصوبہ لے کر شہر آئے ہوں وہ بھلا کب پیچھے رہتے۔
ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہوئیں۔ سفید سے کالا برقعہ پھر چادر۔
سا چشمہ سجا لیا اور دیکھتے ہی
آنکھوں پر انہوں نے سنہری فریم کا خوبصورت
دیکھتے ان کی کایا ایسی پلٹی کہ وہ ہماری ماں کے بجائے بہن دکھائی دینے لگیں۔ اس دوران
ہمارے اطوار بھی بدلنے لگے۔ امی نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ وہاں ہم
نے صبح کی نماز کے بغیر ناشتے کا تصور نہیں کیا تھا یہاں نمازیوں کا تمسخر اُڑایا جاتا تھا۔

وہ کچھ زیادہ ہی روشن
اپنے ننھیال کا تعارف میں نے آپ سے کروا ہی دیا ہے۔
خیال لوگ تھے۔ آہستہ آہستہ ہم بھی ان کے رنگ میں رنگنے لگے۔ مجھ پر دادی کی چھاپ
کچھ ایسی گہری تھی کہ کوئی رنگ نہ چڑھتا تھا۔ چھوٹی بہن کی بات البتہ اور تھی۔ والدہ نے
میرے تجربے سے نصیحت حاصل کی اور اسے شروع ہی سے ننھیال میں اس طرح گھلا ملا کر
رکھا کہ وہ ددھیال سے اسے اتنی ہی نفرت ہو گئی جتنی مجھے اپنے ننھیال سے۔

گھومنے جاتیں۔ سیر
میرے ننھیال کی لڑکیاں سینماؤں میں فلمیں دیکھتیں۔
سپاٹے ہوتے۔ آئے دن پکنک پروگرام بنتے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں دعوتیں اڑائی
جاتیں لیکن اول تو میں ان پروگراموں میں شرکت نہ کرتی۔ اگر بادل نخواستہ کرنی ہی پڑتی تو
بڑی بد دلی سے ان کا ساتھ دیتی۔ چھوٹی بہن کی بات البتہ الگ تھی۔

دو سال پر لگا کر اڑے۔

پہلے پہل تو گاؤں بہت یاد آیا لیکن آہستہ آہستہ صبر آ گیا۔ گاؤں سے اول تو

کوئی ہمیں ملنے ہی نہ آتا تھا۔ اگر کسی نے یہ جرأت کر بھی لی تو امی نے ابو کی غیر موجودگی میں اسے اس طرح ذلیل کیا کہ دوبارہ کسی کو وہاں گھسنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک بیچارے تایا ایسے تھے جو صرف میری خاطر مہینے میں ایک آدھ چکر ہمارے ہاں لگا لیا کرتے تھے۔

میں اب میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ مجھے پڑھنے کا جنون سا تھا۔ ایک خواب دیکھا تھا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننے کا۔ اسی دھن میں پڑھنے میں مگن رہتی۔ پہلے پہل تو سکھیاں کھینچ کر ساتھ لے جایا کرتی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں کسی طرح ان کے ماحول میں 'ایڈجسٹ' نہیں ہو پا رہی تو انہوں نے میرے مختلف نام چڑانے کے لئے رکھ دیئے۔ جب یہ حربہ بھی ناکام رہا تو مجھ سے بے رخی اختیار کرنے لگیں۔

میرے لئے یہ غنیمت تھا!

ان کی دوستی مجھے سوائے ذہنی تناؤ کے اور کچھ نہیں دیا کرتی تھی۔

میں نے ان دنوں دسویں کا امتحان دے رکھا تھا اور بیکار میں پڑی رہتی تھی۔ لڑکیوں کے لئے مخصوص رسائل زیر مطالعہ رہتے تھے۔ اور اب تو یہ نوبت آ رہی تھی کہ میں خود کو ان میں لکھی کہانیوں کا ایک کردار محسوس کرنے لگی تھی۔

کم عمری ہی میں میرا ذہن پختہ ہو چلا تھا۔ میری عمر اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن میری سوچ کا انداز نوجوان اور پکے ذہن کی لڑکیوں کا سا تھا۔ کہانیاں پڑھ پڑھ کر میں بھی خواہش کرنے لگی تھی کہ کوئی شہزادہ آئے اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ان ابتلاء و کرب کی گھڑیوں سے نجات دلا دے۔

تصور ہی تصور میں مَیں نے ایک بت بھی تراش لیا تھا۔ پھر دل ہی دل میں اس کی پوجا بھی شروع کر دی۔ خواب حقیقت کیسے بنتے ہیں اس کا علم مجھے اس روز ہوا جب میرے سپنوں کا شہزادہ ایک روز اچانک حقیقت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

urdufans.com

ہم لوگ پرانے شہر کے ایک محلے میں قیام پذیر تھے جہاں مکانوں کی دیواریں اس طرح بغلگیر ہوتی ہیں کہ سارے مکان ایک ہی مکان دکھائی دیتا ہے۔ پانچ فٹ کی گلی جو صرف تکلفاً خالی چھوڑی ہوتی ہے، کے دورویہ مکانوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ اگر ایک مکان کی کوئی کھڑکی کھلی رہ جائے تو سامنے کے چار پانچ مکان کے مکینوں کو دعوت نظارہ مل جاتی ہے۔ مکانوں کے چھجے اس طرح آگے کی سمت جھکے ہوئے ہیں کہ گلیوں میں دھوپ کا داخلہ ممنوع قرار پاتا ہے۔

ہمارے سامنے والے گھر کی دوسری منزل میں چند روز پہلے نئے کرایہ دار آئے تھے۔ میں بھی اپنے کمرے میں جس کی کھڑکی اس گھر کے عین سامنے کھلتی تھی محو مطالعہ تھی۔ پچھلے دو تین روز سے اس مکان کی کھڑکی جو میرے سامنے کھلتی تھی بند تھی۔ اس روز جو میں آہٹ پر اس سمت چونکی تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ آصف تھا۔ میرا خواب۔ خواب زندہ بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی گمان نہیں گزرا تھا۔!!

یہ دل کی نگری کا کتنا عجیب۔ کتنا نرالا دستور ہوتا ہے۔ اس شہر کی بادشاہت اسی مسافر کا مقدر ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس نگری پر دستک دے۔ اس رات بند کھڑکیوں کے پٹ کھول کر آصف نے مجھ پر محبت کا اسم اعظم پھونک دیا۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ناریل کا سخت چھلکا توڑ کر اس میں سفید پھول کا دل رکھ کر اس کے ریشوں اور پنکھڑیوں میں خوشبو کا خون دوڑا دیا ہو!

میری حالت پہاڑ کی دو درزوں کے درمیان صدیوں سے چاند کی کرن کے انتظار میں رکھے اس پتھر کی سی تھی جسے اس کرن نے موتی میں بدلنا تھا۔ چاند طلوع ہو چکا [illegible] نے ایک مخصوص زاویے سے پتھر پر نچھاور ہو کر اسے موتی بنا دیا تھا۔!

ہمالہ کی سنگلاخ چٹان سے ٹیک لگا کر جدائی کے گیت گاتی دیوداسی کا پردیسی لوٹ آیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے رسالے کی کہانیوں کے تمام ہیروز نے آصف کا روپ دھار لیا اور تمام ہیروئنز نجمہ بن گئیں۔

یہی تو تھا وہ جس نے ظلم کی چکی میں پستی یتیم ہیروئن کو بھری برادری میں اپنا بنانے کا اعلان کیا تھا۔

اسی نے بدقسمت اور معاشرے کی ستائی ہوئی لڑکی کو بڑھ کر گلے لگایا تھا۔

مجبور شہزادی کو نہ جانے کس جن کی قید سے اس نے رہائی دلائی تھی۔

وہ جس نے غریب پھول چننے والی پہاڑن کے گیتوں کو زندگی بخشی تھی یہی تو تھا۔!!

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔!

پھر حجاب آڑے آیا اور میری نظریں خود بخود جھک کر میرے دامن سے الجھنے لگیں جہاں دل کی بے تابو دھڑکنوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔

دوبارہ جب میں نے کن اکھیوں سے اس سمت دیکھا تو وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے ہی اصل میں اس لمحے ایک دوسرے کا چور پکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

امی اور چھوٹی بہن عابدہ دونوں کسی کے ہاں ''ختم'' پر گئی ہوئی تھیں۔ ایسے ''ختم'' اور ''مولود شریف'' اکثر ہمارے گھروں میں بھی برپا رہتے تھے۔ مجھے علم تھا کہ شام سے پہلے ان کی واپسی ممکن نہیں، لیکن پھر بھی میرے اندر کا چور مطمئن نہیں تھا۔ اسی چور کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں کن اکھیوں سے اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھتی اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی تاکہ امی اور عابدہ کی غیر موجودگی کا اطمینان کر آؤں۔

جاتے وقت اس مونڈھے پر (جس پر میں بیٹھی تھی) میں ہاتھ میں پکڑا رسالہ کھول کر رکھ آئی تھی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ میں لوٹ کر آؤں گی۔!

کتنی معصوم ہوتی ہیں ابتدائی محبتیں۔!! جانے کون سیدھی سادی لڑکیوں کو دنیا والوں کی نظروں سے بچنے کے بہانے' جذبات کا اظہار کرنے کی گونگی زبان سے آشنائی بہم پہنچا دیتا ہے۔ شاید محبت اپنی حفاظت کا ڈھنگ بھی جانتی ہے! جب یہ جذبہ کسی معصوم دل پر گرفت کرتا ہے تو حاسد طاقتوں سے محفوظ رہنے کے گر بھی اسے ساتھ ہی سکھا دیتا ہے۔ شاید!

☆☆☆

نچلی منزل کے باہری دروازے تک جا کر میں پلٹ آئی اور دوبارہ اسی مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ آصف بھی حیلے بہانوں سے وہیں موجود تھا۔ ہم دونوں جانے کب تک وہاں بیٹھے ایک دوسرے کو بے قابو دھڑکنوں اور چور آنکھوں سے دیکھا کیے۔ جب اچانک وہ کسی بہانے پر نیچے چلا گیا۔

جانے سے پہلے اس نے بڑی عجیب سی حرکت کی۔ اس نے جاتے جاتے اچانک مڑ کر اپنے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر مجھے سلام کیا اور بھاگ اٹھا۔ میرے وجود کے سارے تار یکدم جھنجھنا اٹھے۔ سخت سردیوں میں بھی پسینے سے میری ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

ایک بے نام سا نشہ مجھے مدہوش کرنے لگا۔ نجانے کتنی دیر تک میں ٹکٹکی لگائے اس کی منتظر رہی لیکن مسافر نہ پلٹا تو عجیب سوگوار سی کیفیت لے کر اٹھی اور دوسرے کمرے میں بستر پر گر کر اپنی بے قابو دھڑکنوں کا شمار کرنے لگی۔ ایک بے نام سا گداز میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ رسالوں میں لکھی جانے والی محبت کی ساری

کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔ ہر ہیروئن کا نام نجمہ اور ہر ہیرو کا آصف ہے۔! شام کو جب والدہ اور عابدہ واپس پلٹیں تو میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے اور دل تو جیسے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے کیلئے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''کیا دیکھ لیا ہے؟'' والدہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ میں اس کے سوال پر کچھ گڑبڑا سی گئی۔

''کمال ہے۔ تمہارے چہرے پر مسکراہٹ۔ ہونٹوں پر ہنسی......؟''

عابدہ نے والدہ کی ہم نوائی کی اور طنزیہ ہنسنے لگی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''ہنسنا اور مسکرانا کیا ممنوع ہے؟'' وہ بولی۔

''ہر وقت دانت نکالنا مجھے اچھا نہیں لگتا عابدہ!'' میں نے سنجیدگی اختیار کرنی چاہی کہ کہیں وہ میرے دل کا چور پکڑ نہ لے۔

''ویسے ہے ضرور کوئی بات......'' عابدہ شرارت سے مسکرائی اور میں سہم کر رہ گئی۔

خدایا! ابھی تو آغاز نہیں ہوا۔ تمہید ہی بندھی ہے۔ ابھی سے اگر یہ راز طشت از بام ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ میری ہر بات پر خواہ مخواہ شک کرنے لگتی ہو''۔

میں نے اپنی دانست میں اسے ڈانٹا ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مجھے اپنی آواز کھوکھلی اور لہجہ مصنوعی سا لگ رہا تھا۔

''تو اس کا مطلب ہے......'' عابدہ نے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا مطلب ہے؟''

''چلو ہمیں پتہ تو چل ہی جائے گا''۔ اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بیوقوف مجھے تو ایک کہانی پڑھ کر بار بار ہنسی آ رہی ہے"۔

جانے کیسے مجھے یہ جھوٹ سوجھ گیا اور عابدہ نے یقین کر لیا۔ اسے میرے مطالعے کی عادت کا علم تھا۔

"زیادہ نہ ہنسنا شروع کر دینا۔ کہیں تمہیں پاگل خانے نہ بھیجنا پڑے"۔ اس نے طنزیہ لقمہ دیا اور وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

رات کو جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو دن کے واقعات نے جو ذہن سے چپک رہے تھے خود کو دہرانا شروع کر دیا۔ سخت سردی کی وجہ سے کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے لوگوں نے حسب توفیق کمروں میں ہیٹر جلا رکھے یا کوئلے کی انگیٹھیاں دہکا رکھی تھیں۔

اس سردی کے عالم میں بھی مجھے اپنی آنکھیں اور ماتھا سلگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ جسم میں ہلکا ہلکا درد ہلکورے لینے لگا۔ پلکیں بوجھل ہو چلی تھیں۔ رات دیر گئے تک میں کروٹیں بدلتی رہی۔ خیالات کے گرداب سے نکلنے کے لئے جب کسی رسالے کو ہاتھ لگاتی الفاظ دھندلا جاتے اور ان میں سے ایک تشبیہ ابھر کر سامنے آ جاتی۔ آصف کی شبیہ۔

امی اور ابو تو نچلے کمرے میں اور عابدہ دوسرے کمرے میں سوتی تھی۔ یہ چھوٹا سا کمرہ میرے تصرف ہی میں رہتا تھا۔ میں نے لائٹ آف کر دی کہ اسی بہانے نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو جائے لیکن نیند کہاں؟

اب تو میرے لحاف میں رکھے پاؤں بھی جلنے لگے تھے۔ میں نے پاؤں لحاف سے باہر نکال لئے پھر بھی گھبراہٹ کم نہ ہوئی تو لحاف اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ تپش سے میرا حلق پیاس کے مارے سوکھنے لگا تھا۔ میں نے اٹھ کر پانی کا گلاس پیا اور ننگے پاؤں فرش

پر ٹکا کر چارپائی پر بیٹھ رہی کہ اس طرح کچھ سکون نصیب ہو جائے۔ جب کسی طرح نیند کی دیوی نہ مانی تو میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ باہر گلی کے ایک کونے میں لگے پول سے پھانسی پر لٹکے بلب کی زرد روشنی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ میری نظریں بے اختیار سامنے گئیں۔ کھڑکی بند تھی۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں لگی سلاخوں سے چہرہ ٹکائے باہر جھانکنے لگی۔ لوہے کی ٹھنڈی سلاخوں سے چہرہ لگا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جلتی آگ پر پانی پھینک دیا ہو۔ مجھے خاصا سکون محسوس ہونے لگا۔ جی چاہتا تھا اسی طرح سلاخوں سے چہرے کو لگائے بیٹھی رہوں جب اچانک ہی مجھے وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔

جی ہاں...... بات ہی کچھ ایسی تھی۔ سامنے والے پٹ وا ہوئے اور ان کے پیچھے سے آصف کا چہرہ برآمد ہوا۔ گلی میں پھیلی پیلے رنگ کی مردہ روشنی اس کے کمرے میں گھس گئی۔ میری آنکھوں کی پتلیوں نے جنبش کرنا بند کر دیا اور میں پتھرائی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اُف میرے خدایا۔ آصف بھی اسی آگ میں پھنک رہا ہے جس کا ایندھن میں بنی ہوئی ہوں"۔

میں نے سوچا۔

میرے پاؤں اچانک سُن ہو کر اپنی جگہ جم گئے تھے۔ چند منٹ پہلے تک جھلستا ہوا وجود مجھے اب بحر منجمد میں پھنسا نظر آ رہا تھا۔ کسی نے میرے پاؤں برف میں گاڑ دیئے تھے اور پاؤں میں سُلگتے انگارے اب ماتھے میں اکٹھے ہونے لگے تھے۔ میں نے چاہا بھی تھا کہ یہاں سے ہٹ جاؤں لیکن زمین نے جیسے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

آصف بھی یقیناً اسی کیفیت کا شکار تھا۔ وہ بھی پہلے میری طرح حیرت سے میری

HBC
urdufans.com

طرف دیکھتا رہا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تڑپی۔ اور اس نے صبح والی حرکت دہرا دی۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کا دایاں ہاتھ کسی مقناطیسی عمل کے تابع ہو کر اٹھا اور اس کے ماتھے سے جا لگا تھا۔ مجھ پر صبح کی طرح پھر گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ بے چین ہو کر میں نے کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی کی چٹخنی چڑھا کر میں اس سے پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اس طرح ہانپنے لگی جیسے سینکڑوں میل کی مسافت پیادہ پا طے کر کے آ رہی ہوں!

کھڑکی کے ساتھ پیٹھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بھی مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کی خوبصورت اور سرخ آنکھوں میں سے برقی لہریں نکل کر میرے جسم کو چھیدنے لگی ہیں۔

کھڑکی سے چارپائی تک کا سفر میں نے ڈگمگاتے قدموں سے طے کیا' پھر میں بے سدھ ہو کر بستر پر جا گری۔ جانے کب مجھے ان بے رحم لمحات سے امان ملی اور میں نیند کی آغوش میں سما گئی۔ جہاں آصف کا ماتھے تک اٹھا ہاتھ کشکول بن کر میری آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگا۔ وہ مجھ ناکس سے کس شے کی بھیک مانگ رہا تھا؟ میرے پاس اسے دینے کے لئے تھا ہی کیا؟......!! میں تو خود منتشر ہو رہی تھی۔ مجھے خود اپنے آپ کی خبر نہیں تھی۔

ساری رات میں نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ وہ بے نام سی عجیب عجیب خواہشیں جو نجانے کب سے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھیں' شکلیں بن کر میرے سامنے ناچنے لگیں۔ یہ کیسا رقص تھا؟

کیسا دردناک سرور تھا یہ! خدا کی پناہ!

صبح اٹھی تو جسم ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ رات بھر کی ''جاگو میٹی'' سے میرا بند بند دکھ رہا تھا۔ آج میرا میٹرک کا نتیجہ نکلنا تھا۔ اصولاً تو مجھے نماز پڑھ کر رزلٹ کا پتہ کرنے اسکول

جانا چاہئے تھا لیکن آنکھ دیر سے کھلی۔ سورج نکل آیا تھا۔ نجانے امی نے بھی آج کیوں مجھے نہ جگایا حالانکہ صبح میرے کبھی بھی دیر سے اٹھنے پر وہ ہنگامہ کر دیا کرتی تھیں۔

ناشتہ ہم نے شہر کی روایت کے مطابق بازار سے منگوایا اور تھوڑی دیر بعد جب میں کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے میں گئی تو دل بے اختیار کھڑکی کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ الٹی سیدھی مانگ نکالی اور کھڑکی کھول دی۔

آصف کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے لیکن سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے دکھ سا ہوا۔ دو تین منٹ میں نے مختلف بہانوں سے کھڑکی کے سامنے گزار دیئے۔ جب مراد بر آتی نظر نہ آئی تو سکول جانے کے لئے چل دی۔ سیڑھیوں میں پہنچ کر یاد آیا کہ پرس کمرے میں رہ گیا ہے۔ اس مرتبہ جب پرس اٹھانے گئی تو دل دھک سے رہ گیا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے لگا آصف میرے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ رات کی طرح زمین نے ایک مرتبہ پھر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ مجھے کچھ اور تو نہ سوجھا۔ دیوار کی طرف منہ کر کے دوپٹے کا پلو مروڑنے لگی لیکن کن انکھیوں سے میں اس کو دیکھتی رہی۔

آصف کو شاید علم تھا کہ میں نے بہانے سے دوسری سمت منہ کیا ہوا ہے۔ میری نظریں اسی پر لگی ہیں۔ اس نے وہی حرکت دہرائی اور ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لے گیا۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں اس کی آنکھوں کی حرکت بھی نوٹ کر رہی تھی۔

اس لمحے میرا جی بے اختیار اس شخص کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنے لگا جس نے اظہار محبت کے لئے سلام کرنے کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو گا۔ شاید اپنے کسی لاشعوری فعل کے تابع میرا ہاتھ بھی بے اختیار سر کے بالوں سے چھو گیا۔ یہ سب کچھ ایک بے خودی کی سی حالت میں مجھ سے سرزد ہوا۔ جب مجھے اپنی اس معصوم غلطی کا احساس ہوا تو گھبراہٹ اور شرم کے مارے میں بے حال ہونے لگی۔ سینے کے پنجرے میں دل کا پنچھی بری طرح پھڑ

HBC
urdufans.com

بھرا ہوا تھا۔

میں بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹی۔ مڑتے ہوئے میں نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔ ہماری آنکھیں پوری آگہی کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ خوشی سے ہم دونوں کے چہرے ہی گلنار ہو رہے تھے۔ کمرے سے میں تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی۔ میری حالت اس چور کی سی تھی جسے ہر لمحے پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

''جلدی واپس آنا۔ ہم نے میاں جی کے گھر مولود شریف پر جانا ہے''۔

امی نے رسوئی سے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

''اچھا امی!'' بمشکل میں نے کہا۔

گھر کے دروازے سے میری نظر اسی سمت اٹھی تھی' آصف اپنے کالج کا بلیزر (کوٹ) پہنے ہاتھ میں فائل لئے شاید میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے ہمارے شہر کے سب سے بہترین کالج کا کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کی تعلیمی قابلیت کا غماز تھا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یقیناً یہی سب کچھ میں نے اپنے آئیڈیل سے متعلق سوچ رکھا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ قدرت نے اسے میرے لئے ہی یہاں بھیجا ہے۔

ہمارے محلے کے لوگوں کے ذہن بھی گلیوں کی طرح تنگ اور گندگی بھرے تھے۔ مجھے علم تھا میری یا اس کی کسی بھی غیر معمولی حرکت پر اگر کسی کو شک ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔ ایسے ایسے افسانے تراشے جائیں گے کہ جنہیں سننے کی کسی میں تاب نہ ہو۔

یہاں کے لوگوں کا بہترین مشغلہ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اور ان کے متعلق سوچ سوچ کر خوامخواہ اپنے ذہن سے اپنی مرضی کا نظریہ گھڑ لینا تھا۔ میں نے اس کے اسمارٹ سراپے پر بھرپور نظر ضرور ڈالی تھی لیکن یہ بات میرے پیش نظر تھی کہ یہاں کئی میلی نظریں مجھے کھا جانے کی حد تک گھور رہی ہیں اور مجھے ان سے خود کو ہی نہیں آصف کو بھی بچا کر رکھنا ہے۔

آصف کو بھی شاید تھوڑے ہی دنوں میں یہاں کے قوانین اور طور طریقوں کی سمجھ آ گئی تھی۔ وہ مجھ سے بظاہر بالکل لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور نپے تلے

HBC
urdufans.com

قدموں سے باہر جانے والے راستے پر گھوم گئی۔ اس بات کا احساس میرے لئے بڑا لذت آمیز تھا کہ آصف میرے تعاقب میں آئے گا۔

گلی کا موڑ مڑتے ہوئے میرے اندازے کے عین مطابق میں نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھا' اگر مجھے اس سے خصوصی نسبت حاصل نہ ہوگئی ہوتی تو اس کے محتاط رویے کے پیش نظر میں بھی کبھی اس پر اپنے تعاقب میں آنے کا شک نہ کرتی۔

بس سٹاپ تک وہ اسی طرح میرے پیچھے پیچھے آیا اور بس میں سوار ہوگیا جس میں بیٹھ کر مجھے سکول جانا تھا۔ میرے سکول اور اس بس سٹاپ کے درمیان' جہاں میں اترا کرتی تھی' تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ آصف میرے پیچھے ہی بس سے اترا اور آہستہ آہستہ چلتا میرے نزدیک آگیا۔ اس راستے پر لوگوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔

اُس کو قریب آتا محسوس کر کے یقین مانئے مجھے اپنی جان ہی تو نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ خود اس نے بھی اتنی جرأت کا مظاہرہ کیسے کیا یہ میں کبھی نہ جان پائی ...!

اب سوچتی ہوں کہ یہ عشق کا جذبہ کمبخت ہوتا ہی ایسا ہے۔ بزدل کو بہادر اور بہادر کو بزدل بنا دیتا ہے۔ آصف عام نوجوانوں سے بالکل مختلف' سیدھا سادا' محنتی اور فرمانبردار نوجوان تھا۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور ماں باپ کے مستقبل کی امید ! ایسا نوجوان جس نے بہت تھوڑی عمر میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر لیا تھا۔ خدا جانے اسے مجھ میں کیا نظر آیا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

''آپ کا نام نجمہ ہے۔'' اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے صرف ایک بات کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کسی نے گزرتے ہوئے اسے یہ حرکت کرتے دیکھ نہ لیا ہو لیکن ہائے ری محبت...... انسان کو کیا کیا ڈھنگ سکھا دیتی ہے تو...... آصف نے اتنی چالاکی سے اپنی بات مجھ تک پہنچائی کہ خود مجھے

بھی محسوس نہ ہو سکا کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ یہ بات کہہ کر اس نے مجھے ایک دو قدم آگے نکل جانے کا موقع دیا۔

اس کی ایک بہن عابدہ کی سہیلی بننے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ ممکن ہے اس کے ذریعے میرا نام اس تک پہنچ گیا ہو۔ دل نے کہا پگلی! کیوں ڈرتی ہے۔ کہہ دے نا!

''آپ کا نام ؟'' میں نے بے قابو دھڑکنوں کو زبان دی۔

''آصف آپ نے میری بات کا بُرا تو نہیں منایا......'' اس نے جواب سوال اکٹھا ہی کر دیا۔

میں خاموش رہی۔ زبان گنگ ہو رہی تھی۔ دل تو چاہتا تھا فوراً کہہ دوں ''نہیں شہزادے! مجھے تو جانے کب سے تمہارا انتظار تھا۔ میری تپسیا مکمل ہوگئی ہے۔ میرا بن باس پورا ہوگیا ہے''......لیکن کچھ نہ کہہ پائی۔

آصف میرے نزدیک آچکا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں صرف مسکرا دی اور ہونٹوں پر ''نہیں'' لرز کر رہ گیا۔ سامنے سے لڑکیوں کی ایک ٹولی آرہی تھی۔

''شکریہ'' کہہ کر وہ اپنا دمکتا چہرہ لے کر پرے ہٹ گیا۔ میرا اسکول نزدیک آگیا تھا۔ آصف پہلو بدل کر دوسری سمت مڑ گیا۔

☆☆☆

بے ترتیب سانسوں' بے قابو دھڑکنوں پسینہ پسینہ وجود کے ساتھ جب میں ہونٹوں کی لرزش سنبھالتی سکول پہنچی تو معلوم ہوا کہ میں سکول میں دوسرے نمبر پر آئی ہوں۔ بس شادی مرگ کی کیفیت ہی طاری نہیں ہوئی ورنہ اس میں کسر ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

سہیلیاں مجھے مبارکباد دے رہی تھیں...... علیحدگی کے رونے روئے جا رہے تھے۔ مستقبل میں ملنے کے منصوبے۔ نئے کالج میں داخلے کی باتیں' ایک دوسری کے گھروں کے

urdufans.com

ایڈریس' لیکن میں ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ بظاہر تو میں ان کے درمیان کھڑی ان کی مبارکباد وصول کر رہی تھی اصلاً میری روح کہیں اور پرواز کر رہی تھی۔ میں تصور ہی تصور میں پرواز کرتی کھڑکی کی سلاخیں تھامے اپنے سامنے کھڑے آصف کو اپنی کامیابی کا مژدہ سنا کر اس کی مبارکباد وصول کر رہی تھی۔

وہ بڑے نصیبوں والا دن تھا۔

کئی خوشیاں ایک ساتھ ملی تھیں مجھے۔

سارے خواب حقیقت بنتے جا رہے تھے۔ میرا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا......! ان دنوں خود کو کتنا خوش بخت جاننے لگی تھی میں۔

آج سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ اصل میں تقدیر نے میرے ساتھ بھیانک مذاق کا آغاز اسی روز کیا تھا جب کہ میرا ''چناؤ'' دم پیدائش ہی ہو چکا تھا۔ فلسفہ تقدیر کبھی میرے ذہن میں نہیں سما پایا۔ میں آپ کو بھی اس کی موشگافیاں سمجھانے نہیں جا رہی لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ اس لمحہ اگر کوئی میرا بازو پکڑ کر مجھے سرابوں کے اندھے جزائر سے حقیقت کی راہ پر ڈال دیتا تو یہ روز بد میرا مقدر نہ بنتا..... !

بھاگم بھاگ گھر پہنچی جہاں ماں اور چھوٹی بہن بنی ٹھنی باہر جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔

عابدہ دوسرے سکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا رزلٹ ابھی نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آصف کی بہن کو اپنی البم دکھا رہی تھی جو اس کے عجیب و غریب پوز بنا بنا کر کھنچوائی گئی تصاویر سے بھری پڑی تھی۔

''امی! میں سارے سکول میں سیکنڈ آئی ہوں۔ میں نے سکالرشپ حاصل کیا ہے۔''

میں خوشی سے چلاتے ہوئے امی سے لپٹ گئی۔

''اری ہٹ پرے کیوں میرے کپڑوں کا ستیاناس کر رہی ہے۔ سارا سارا دن سوائے پڑھنے کے اور تجھے کام ہی کیا ہے کرنے کو سارا سکول چھوڑ تجھ کو تو سارے ملک میں اول آنا چاہئے تھا۔ گھر بار کی فکر تو نجانے تجھے کب ہوگی۔ کم بخت تجھ سے تو زیادہ عقلمند یہ چھوٹی ہے۔ جہاں جاتی ہے لوگ تعریفیں کرتے ہیں۔ ایک تو ہے گھر میں منہ دیئے پڑی رہتی ہے۔ پڑھاکو کہیں کی''۔

امی نے تقریباً مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

امی کے اس رویے سے دل بجھ سا گیا لیکن پھر میں جلد ہی نارمل ہو گئی کیونکہ مجھے ان کی عادت کا علم تھا۔ وہ مجھ سے زبردست ذہنی اختلاف رکھتی تھیں۔ دادی اماں نے میرے اور ان کے درمیان سوچوں کے متضاد انداز کی جو خلیج حائل کر دی تھی اسے پاٹنا میرے لئے تو مشکل تھا ہی جب کہ امی کے لئے ناممکن تھا۔ وہ مجھے اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بن سنور کر ان کے ساتھ سیر سپاٹے کیا کروں تاکہ میرے حسین سراپے کی نمائش کر کے وہ اپنی کسی مخصوص حس کو تسکین پہنچا سکیں وہاں ان کی خود ساختہ سوسائٹی میں ان کا وقار مزید بڑھ جائے کہ موصوفہ ایک عدد خوبصورت بیٹی کی ماں بھی ہیں۔

''آپ کو مبارک ہو باجی!''

آصف کی بہن فرزانہ نے مجھے مخاطب کیا۔

''شکریہ۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ اُس کی طرف اُچھالی۔

امی کے نامناسب رویہ نے فرزانہ کو بھی سوگوار سا کر دیا تھا۔ لڑکی رحمدل معلوم ہوتی تھی۔

''امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اگر باجی کو گھومنا پسند نہیں تو اس میں زبردستی ہے

کیا؟

عابدہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے قریب کھینچ لیا اور میری دلجوئی کو امی سے کہہ دیا۔

"اے لو! بیٹی کون سی قیامت آ گئی ہے۔ ایک ذرا سمجھایا ہی ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں ڈائن نہیں......"

انہوں نے عابدہ کے بھی لتے لینے شروع کر دیے۔

فرزانہ شاید ایسی باتوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ امی کو بولتا دیکھ کر ہم سے "ضروری کام" کا بہانہ کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی امی اور عابدہ بھی شاہ صاحب کے ہاں مولود شریف پر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں اپنے جہانوں میں لوٹ آئی۔ اپنی دنیا میں جہاں میں تھی۔ آصف تھا۔ اور ہمارا شاندار مستقبل تھا۔ میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور کھڑکی کے سامنے رکھا موڑھا سنبھال لیا۔

کھڑکی کھلی تھی لیکن آصف وہاں نہیں تھا۔ میری نظریں بار بار بے چینی سے اس طرف اٹھ جاتیں اور مایوس لوٹ آتیں۔ پھر جیسے میری آنکھوں کی تراوٹ لوٹ آئی۔ آصف میرا خواب میرے سامنے موجود تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔

شاید وہ کالج سے سیدھا اوپر آ رہا تھا اور کالج میں بھی اس نے آج بھی "کارنامہ" انجام دیا تھا جو تھوڑی د[illegible] نہ ہی اس کے ہاتھ سے نکلا اور پرواز کرتا میری کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں [illegible]۔ میں نے اسے لرزتے ہاتھوں سے اٹھایا اور نچلے کمرے میں چلی آئی۔

نیلے رنگ کا خوبصورت پیڈ تھا جس پر دل بنا کر اس میں تیر ترازو کرنے کے بعد

urdufans.com

خون ٹپکتا دکھایا گیا تھا اور ایک دردناک قسم کا شعر پیشانی پر تحریر تھا۔ آصف نے لکھا تھا۔

"میری نجمہ!

پچھلے سات آٹھ روز سے میں تمہیں روزانہ چوری چھپے دیکھا کرتا تھا لیکن تمہارے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اسے میرا خوف نہ جان لینا۔ ہم پٹھان لوگ جس کے بن گئے جی جان اس پر وار دیتے ہیں۔ یہ تو رعب حسن تھا جس کے سامنے ٹھہرنے کی مجال نہیں پاتا تھا۔ صبح جب تم نے میرے سلام محبت کو شرف قبولیت بخشا تو گویا تم نے میری ارجمندیوں کا بند دروازہ مجھ پر کھول دیا تھا۔ تم نے جس کیفیت کا شکار مجھے کل رات دیکھا تھا میں پچھلے پانچ روز سے اسی عذاب میں گرفتار ہوں لیکن تمہارا بند دروازہ کل ہی کھلا۔ شاید قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا تھا۔

نجمہ!

میری محبت کو ندی کی سطح پر بننے والا وہ بلبلہ نہ سمجھ لینا جو تھوڑی دیر بعد اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اس میں ندی جتنی گہرائی اور سمندر کی لہروں جتنی طاقت ہے۔

میں نے بڑی طویل ریاضت کے بعد تمہارا "نروان" حاصل کیا ہے۔ تمہاری محبت کی آگ میرے دل کے معبد میں ہمیشہ جلتی رہے گی۔ میں اس کی روشنی میں حیات کے سارے اندھیارے پاٹ لوں گا۔ جب فرزانہ نے بتایا کہ تم نے سکالرشپ حاصل کیا ہے تو مجھے اپنے مقدر پر رشک آنے لگا۔ نجمہ! میں الیف ایس سی فائنل میں

urdufans.com

پڑھتا ہوں اور میں نے بھی میٹرک میں سکالرشپ حاصل کیا تھا۔

اب تمہاری محبت میرے جذبوں کو مہمیز لگائے گی اور میں ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ اپنی منزل انجینئرنگ کی ڈگری کی طرف بڑھوں گا اور ایک روز بامراد ہو کر تمہارے والدین کے آگے دامن پھیلا دوں گا۔

ہمیشہ سے تمہارا

آصف

اُس کا خط تو بہت طویل تھا۔ مجھے اتنا ہی یاد رہ گیا ہے۔ میرے جذبات کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جو زندگی کے ابتدائی مراحل ہی میں ان منازل سے گزرے ہوں۔ دنیا کی کسی زبان کی کسی ڈکشنری میں وہ الفاظ نہیں جو میرے جذبات کو زبان دے سکیں۔ بس ایک نشہ سا تھا جو میرے رگ و پے میں سمایا اور میں مدہوش ہوتی چلی گئی۔

عورت بنیادی طور پر خوفزدہ اور بزدل مخلوق ہے۔ میں آج جس حیثیت میں ہوں وہاں دنیا کے جابر ترین مرد میری جوتیاں چاٹتے ہیں' میرے ایک اشارے پر بڑے بڑے سورماؤں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میں جسمانی طور پر کسی بھی مرد کو چیلنج کرنے کی پوزیشن رکھتی ہوں۔ لیکن مجھے صدقِ دل سے اقرار کرنا ہے کہ عورت بزدل اور خوفزدہ ہوتی ہے۔ اور مرد نے اس کی اسی کمزوری کو ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ اُسے تحفظ کا احساس دلا کر لوٹتا ہے۔ اس کے لاشعور میں رہتے بسے خوف کو عجیب عجیب شکلوں میں اس کے سامنے کھڑا کر کے اسے نوچا کھسوٹا ہے۔

یہ ازل سے ہوتا آ رہا ہے اور شاید ابد تک ہوتا رہے گا۔ کیونکہ انسان میں موجود ن کبھی نہیں مر سکتا۔ جبری دور کا نظام قبائلیات اُس میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آدمی کی بہیمت تہذیب' مذہب' اخلاق کی گولیاں وقتی طور پر گہری نیند تو سلا سکتی ہیں۔ مار نہیں سکتیں۔

یہ فلسفہ جو میں نے بیان کیا میرے ذاتی تجربات کی دین ہے۔ ممکن ہے زندگی کو منفی انداز میں مسلسل دیکھنے اور بسر کرنے سے میری سوچ کا انداز بھی زرا منفی ہو کر رہ گیا ہو۔

لیکن...... ایسی بات ہرگز نہیں۔ میرے لاشعور میں جو نیکی میری دادی اماں نے انجیکٹ کی تھی وہ کبھی نہیں مر پائی۔ جس طرح برائی کبھی نہیں مرتی' نیکی بھی اپنے فاتحانہ وجود کے ساتھ ہر جگہ ہر برے انسان میں موجود رہتی ہے اس بات کا ثبوت آپ کو میری کہانی میں جگہ جگہ ملے گا۔

☆☆☆

تب میں صرف نجمہ تھی......! میڈم نہیں تھی۔ میری سوچ عام لڑکیوں کی سی تھی۔ انہی لڑکیوں کی سی جو خواتین کے رسالے پڑھ کر خوابوں میں زندہ رہتی ہیں جو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خواب دیکھتی ہیں جن میں یہ خواہش شدت سے جنم لیتی ہے کہ کوئی انہیں بازوؤں میں بھر کر اُن کی دھڑکنوں کو اپنی دھڑکنوں کا حصہ بنا لے لیکن جو اپنے عاشقوں کے خطوط کا جواب اس لئے نہیں دیا کرتیں کہ بدنامی کا خوف انہیں دامن گیر رہتا ہے۔ ''مرد کی نیت کا کیا اعتبار۔ جانے کب بدل جائے'' یہ سوچ انہیں ہمیشہ بزدل بنائے رکھتی ہے وہ اپنی منزل سامنے دیکھتے ہوئے بھی اس سے پرے ہٹ جاتی ہیں اور زندگی بھر گئے وقت کو روتی رہتی ہیں۔

میں نے تب یہی سوچا تھا کہ میں بھی آصف کو ٹوٹ کر چاہوں گی۔ اس کی جیون ساتھی بننے کا سپنا میں نے بھی دیکھا تھا لیکن یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اس کے خط کا جواب نہیں دوں گی۔ کہیں کوئی خط کسی کے ہاتھ لگ گیا تو میرا بھرم ٹوٹ جائے گا میری ماں جیت جائے گی اور میں مر جاؤں گی۔

میں نے وہ خط بار بار پڑھا۔ اُس کے ایک ایک لفظ میں چھپے جذبے سے جڑ

HBC
urdufans.com

اٹھایا۔ اس کی ایک ایک سطر میں جھلکیاں مارتے اپنے سنہرے مستقبل کا مزا آنکھیں بند کر کے لیا۔ میں ڈاکٹر۔ میرا آصف انجینئر۔ کتنی شاندار جوڑی ہو گی۔ لوگ ہماری مثالیں دیا کریں گے۔ ہم پر رشک کیا کریں گے۔ ہم سے حسد کیا کریں گے۔

تصور ہی تصور میں میں نے محل بنائے اور ڈھا دیے۔ ہر مرتبہ کوئی رنگ بھرنا باقی رہ جاتا۔ ہر مرتبہ ان کو نیا رنگ دیتی۔

شام تک میں دوبارہ کھڑکی کھولنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ میں نے خط کو تہہ کر کے پہلے اپنے سینے کے نزدیک دھڑکنوں میں سمویا پھر ایک کتاب میں رکھ کر اپنی الماری میں تالا لگا کر محفوظ کر دیا۔ اس تالے کی دوسری چابی میں نے جان بوجھ کر گنوا دی اور واحد چابی میرے پاس محفوظ رہی۔ میں نے مقدس امانت کی طرح اپنی اولین محبت کے معصوم اور پاکیزہ اوراق محفوظ رکھے اور آج بھی یہ صحیفے میرا سرمایہ حیات ہیں۔

جب کبھی چند منٹ کے لئے ضمیر انگڑائی لے کر زندہ ہوتا ہے۔ مجھے کچوکے لگا کر اپنی پرانی دنیا کی سیر کرواتا ہے۔ اپنے عورت ہونے کا احساس دلاتا ہے تو یہی خطوط میرا واحد سہارا ہوتے ہیں۔ تب میرے پاس زندگی میں ضمیر کی عدالت میں پیش کرنے کے لئے صرف ایک ہی ثبوت رہ جاتا ہے۔ یہ کاغذ کے پرزے۔ جو اپنے اوپر لکھے سچے اور سچے جذبوں میں گندھے لفظوں کی طرح زندہ ہیں۔

لوگ مر جاتے ہیں۔ ممکن ہے یادوں کو بھی موت آ جاتی ہو۔ لفظ کبھی نہیں مرتے۔ جذبے زندہ جاوید ہوتے ہیں۔ فضا میں کروڑوں محبت کرنے والوں کے کہے لفظ ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی چاہے دل کی ایک مخصوص فریکوئنسی پر ان کی آواز سن لے۔ ان کی حقیقت کو جان لے۔

شام کو تھوڑی دیر کے لئے امی اور عابدہ آئیں اور چلی گئیں۔ انہوں نے میاں

صاحب کے گھر بیٹھ کر ہی میرے فسٹ آنے کی خوشی میں ایک ''محفل ہاؤ ہو'' برپا کرنے کا پروگرام طے کر لیا تھا اور اب وہ لوگوں کو ''سدے'' (دعوت نامے) دینے کی مہم پر نکل گئی تھیں۔ والد صاحب قبلہ رات گئے ہوٹل اور دوستوں کی محفلوں سے فراغت پا کر گھر لوٹتے تھے۔ انہیں بیگم صاحبہ کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی یا پھر شاید وہ اس ''نازک مسئلے'' کو چھیڑنا مناسب ہی نہیں جانتے تھے۔ ان کی زندگی کا تو صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ دن رات حرام اکٹھا کریں اور اپنی زوجہ محترمہ کی ہر خواہش کے سامنے بلا چون و چراں سر جھکاتے چلے جائیں۔

والدہ اور بہن کے رخصت ہوتے ہی میں نے چولہا سنبھال لیا تاکہ واپسی پر ان کو کھانا تیار ملے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں اپنے آسن پر آن براجی۔ اس لمحے جب میں نے آصف کا چہرہ دیکھا تو مجھے بہت ترس آیا۔ بے چارہ کتنی بے چینی اور بے قراری سے وہاں جانے کب سے ٹہل رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے ہاتھ کے اسی جان لیوا اشارے سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے گردن جھکا کر اس پر سر تسلیم خم کیا۔ ہم چاہتے تو ایک دوسرے سے باتیں بھی کر سکتے تھے لیکن یہاں ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی دوسری کھڑکی برابر سے نہ کھل جائے' کسی کی نظر ہم پر نہ پڑے' کوئی ہمیں دیکھ نہ لے' کہیں یہ نہ ہو جائے' کہیں وہ نہ ہو جائے۔ عجیب عجیب وسوسوں کے سانپ کنڈلی مارے ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔

آصف نے ہاتھ کے مخصوص اشاروں سے مجھ سے پوچھا میرے خط کا کیا بنا!

میں جواب میں صرف مسکرا کر رہ گئی۔

دوبارہ اس نے ہاتھوں سے خط پھاڑنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا' کیا اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔

HBC
urdufans.com

میں نے گردن نفی میں ہلا دی اور مسکراتی رہی۔

ہاتھ کے اشارے سے اس نے محبت نامہ کا انجام دریافت کیا۔

میں نے اسے ہاتھوں کے اشارے سے تسلی دی کہ مطمئن رہو۔ پھر اس کے اصرار کرنے پر تہہ شدہ خط منہ دوسری طرف پھیر کر دل کی دھڑکنوں سے الگ کر اسے دکھایا اور اشاروں سے بتایا کہ میں نے اسے کیا مقام دیا ہے!

آصف کا چہرہ ایسے ندیدے بچے کی طرح خوشی سے اچانک دمک اٹھا جسے دو گھنٹے مسلسل رونے کے بعد اپنی مرضی کا کھلونا نصیب ہوا ہو۔

"جواب دو گی؟"

اس نے کھڑکی سے منہ لگاتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور ہاتھ باندھ کر درخواست کی کہ زیادہ جذباتی نہ بنے اور ارد گرد سے ہوشیار رہے۔

اس نے دل پر ایک ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کو منفی انداز سے ہلا کر گویا یہ کہا کہ وہ اس دل بے قرار کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اب اس سے صبر نہیں ہوتا۔

"ایسی بے صبری بھی کیا"۔

بالآخر میں بھی سرگوشی میں کہے بنا نہ رہ سکی۔ شاید اس بات کے پیچھے اس کی آتش شوق کو مزید بڑھانے کا جذبہ کارفرما ہو۔

"کل مجھے ضرور ملیئے گا"۔

اس نے اپنی آواز کو حتی الوسع دبائے رکھا۔

میں اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش ہو رہی۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا۔

"کل نہیں پھر کسی روز۔ داخلے کھلنے والے ہیں نا۔ کسی روز فارم لینے کے بہانے

جاؤں گی"۔

میں نے معذوری ظاہر کی۔

"آپ کل سکول سے رزلٹ کارڈ لینے کے بہانے بھی جا سکتی ہیں"۔ اس نے بے چینی سے کہا۔

اس لمحے آصف کی اس ادا پر مر جانے کو جی چاہا۔

"گویا آپ نے بہانہ بھی خود ہی ڈھونڈ رکھا ہے میرے جانے کا"۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ دل کا معاملہ بس ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا کروں"۔

اس نے معذوری ظاہر کی۔

"لیکن جناب ابھی تو میرا رزلٹ بھی بورڈ سے سکول نہیں آیا ہو گا۔ یہ آپ بھول گئے تھے کیا"۔

میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہات تیرے کی....."

اس نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہا کہ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی پھر اچانک رک گئی کیونکہ آصف سے ملحقہ مکان کی کھڑکی کھلنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں اگلا منظر دیکھنے کے لئے وہاں نہ رکی اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

اس رات میں نے ڈر کے مارے کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کی ہمت ہی نہ کی۔

میرے ذہن میں شام ہی سے ایک ڈر سا پیدا ہو چلا تھا۔ کہیں ہمسایوں کو ہم پر شک تو نہیں ہو گیا؟ آخر وہ کھڑکی پہلے کبھی کیوں نہیں کھلی؟

UBC
urdufans.com

ضرور کوئی چوری چھپے ہماری حرکات نوٹ کر رہا تھا۔

اس خوف نے تو میری بھوک پیاس بھی ختم کر دی تھی۔ بمشکل میں نے چند لقمے ہی زہر مار کیے تھے مبادا گھر والوں کو کوئی شک نہ گزرے اور سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گئی۔

''اب مہارانی نخرے تو کرے گی۔ خیر سے سکول میں سیکنڈ جو آ گئی ہے''۔

امی نے ابو کو بتایا جو آج خلاف معمول ذرا پہلے چلے آئے تھے۔

''زہراں! تم کمال کرتی ہو۔ تمہیں تو خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے اس سے''۔

اس روز نجانے ابو نے اتنی جرأت کیسے کر لی۔

''ہاں جی! تم تو خیر سے یہی کہو گے۔ آخر ہو کس ماں کے بیٹے۔ خدا کا شکر کرو اسے گاؤں سے نجات دلا کر شہر لے آئی ہوں تو سکول کالج کے نام بھی آ گئے ہیں باپ بیٹی کو۔ ورنہ صاحبزادی کہیں اُپلے تھاپ رہی ہوتی''۔

امی اپنا یہ احسان کسی نہ کسی بہانے جتاتی رہتی تھیں کہ وہ ہمیں گاؤں سے شہر لے آئی ہیں اور ہمیں شہری ماحول کی برکت سے کچھ تعلیم و تہذیب کا پتہ چل گیا ہے ورنہ ہم تو بالکل گدھے تھے۔

ابو کو علم تھا کہ اگر آگے کوئی بات کی تو سلسلہ دور تک نکل جائے گا۔

''اچھا بابا تم جیتیں میں ہارا۔ اگر بدقسمتی سے گھر آ ہی گیا ہوں تو روٹی تو سکون سے کھا لینے دو''۔ وہ بولے۔

وہ ساری رات میں نے ڈر ڈر کر گزار دی۔ اگلے روز صبح بھی میں نے کھڑکی نہیں کھولی۔ وہی وہم اب تک موجود تھا۔

''اب کیا ہمیں دم گھٹا کر مارنے کا پروگرام ہے''۔

امی نے بدستور بند کھڑکی دیکھ کر کہا۔

یہاں ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کا واحد ذریعہ یہ کھڑکیاں ہی

روشندان نام کی چیز ان مکانوں میں نہیں پائی جاتی کیونکہ روشندان کی جگہ وہ لوگ ڈربہ بنا کر رکھنے کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

''اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی''۔ کہہ کر میں دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھی اور کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھول دی۔

کھڑکی کھول کر میں یکدم واپس پلٹ گئی جیسے وہاں کھڑے رہنے پر باہر سے کوئی شے مجھ پر حملہ آور ہو جائے گی۔ اس کے بعد خوف کے مارے میں پانچ دس منٹ تک کمرے میں نہ گئی۔ پھر چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے بہانے سے چوروں کی طرح اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو خوشی کی ایک لہر میرے سارے جسم میں رینگ گئی۔ سامنے آصف کھڑکی کے قریب ناشتہ کر رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا لقمے والا ہاتھ اٹھنے کا اٹھا رہ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

''کیا بات تھی نکل بھاگ کیوں گئی تھیں؟''

میں نے ملحقہ مکان کی طرف اشارہ کر کے خطرے کی نشاندہی کی اور اپنا شک ظاہر کیا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔

آصف نے دائیں ہاتھ کی انگلی کنپٹی کے گرد گھماتے ہوئے شاید یہ کہا تھا کہ تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے نزدیک آنے کو کہا اور بولا۔

''محترمہ! خواہ مخواہ خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں۔ لوگوں کو ہماری طرح صرف یہ نہیں کچھ اور کام بھی ہیں''۔

اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ میں بے اختیار ہنس دی۔

HBC
urdufans.com

"کیا بات ہے بڑی خوش نظر آ رہی ہو"۔

اچانک دوسرے کمرے سے امی کے اس طرف آنے کی آواز سنائی دی اور میں کسی میکانکی عمل کے تابع اچانک ہی اس طرف گھوم گئی۔ آصف نے بھی شاید "خطرے" کا احساس کر لیا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ جب امی کسی کام سے میرے کمرے میں پہنچیں تو اس کے کمرے کی کھڑکی بند نظر آ رہی تھی۔

"سکول کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔ امی کل......" میں نے ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بہانہ تراشا۔

"بس جانے دو۔ کبھی اس موئی پڑھائی کے علاوہ بھی کوئی بات کر لیا کر"۔ انہوں نے میرے کمرے کے ایک کونے میں لٹکی اپنی چادر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آج تیرے باپ کے دفتر سے لوگ آ رہے ہیں۔ کہیں دفع نہ ہو جانا"۔ انہوں نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"باپ" کے دفتر کے افسران اور میاں جی کا ہمارے ہاں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی کی دعوت ہمارے ہاں رہتی تھی۔ ان دعوتوں میں "کمائی" کے حصے بخرے ہوتے۔ رشوت لینے کیلئے نئے محفوظ طریق کار طے کئے جاتے۔ نئے نئے منصوبے ترتیب پاتے۔ فائلوں کو کہاں دبانا ہے۔ کس نے کس طرح "گاہک" کو دوسرے تک پہنچانا ہے۔ فلاں کام سے فلاں کام تک کے ریٹس کیا لئے جائیں گے۔ یہ ساری گفتگو عموماً انہی دعوتوں میں ہوتی تھی۔

مجھے نفرت تھی ان سب کاموں سے۔ ایسی باتوں سے۔

آج یہ کہتے ہوئے سوچتے ہوئے حیرانگی ہوتی ہے۔ خدایا میں کبھی ایسی پاکباز لڑکی بھی تھی۔

اس روز ایک عجیب سا تجسس میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ میرے اندر خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ میں ان کی گفتگو سنوں اور دیکھوں آخر یہ لوگ کس کس طور سے نئے شیطانی منصوبے ترتیب دیتے ہیں۔

اس دن دفتر کا "ہاف ڈے" تھا۔ امی نے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے امی "میاں جی" کی منحوس شکل دکھائی دی جس کی موجودگی کے بغیر ہر محفل ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ خدا جانے لوگوں کو اس سے کیا لالچ ہوتا تھا۔ وہ تو شکل ہی سے چھٹا ہوا غنڈہ اور پیر کے بجائے کسی بدقماش گروہ کا سرغنہ دکھائی پڑتا تھا۔

وہ لوگ میرے سامنے والے کمرے میں بیٹھا کرتے تھے جہاں سے گفتگو کی آواز مجھے صاف سنائی دیا کرتی تھی۔ امی اس کی منحوس صورت دیکھتے ہی "میاں جی" "میاں جی" کہتی اس طرف بڑھیں لیکن اس کی ہوسناک نظریں حسب سابق امی سے پھسلتی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے آج تک اسے سلام نہیں کیا تھا۔ اس معاملے پر متعدد مرتبہ امی اور میرے درمیان تو تو میں میں ہو چکی تھی لیکن میں نے ان کی یہ بات کبھی نہ مانی۔

میں بچی نہیں تھی۔ جس ماحول میں میری پرورش پچھلے دو سال سے ہو رہی تھی اس میں رہتے ہوئے مجھ سے زیادہ اور کون مرد کی ہولناک نظروں کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ میں اس کے سامنے سے ہٹی اور اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی جہاں سے تھوڑی دیر بعد ہی امی اور اس کے درمیان باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"میاں جی! میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔ مولا خیر کرے۔ کوئی مصیبت تو آنے والی نہیں؟"

امی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"زہراں! بڑے بڑوں کے دانت دیکھے ہیں میں نے۔ مرشد کی دعا سے میرا وار

HBC
urdufans.com

خالی نہیں جا سکتا۔ تو بے فکر ہو جا۔ بڑے بڑے ایماندار آئے اور چلے گئے۔ میں ایک سیکرٹری کو ہاتھ میں لے رہا ہوں۔ بیٹے کا ایسی جگہ تبادلہ کراؤں گا کہ یاد رکھے گا''۔ میاں جی نے جواب دیا۔

خدا خیر کرے۔ میں سہم گئی۔ معاملے کی کچھ کچھ سمجھ مجھے آنے لگی تھی۔ شاید ابو پر کوئی مصیبت آ رہی تھی جس کے تدارک کے لئے امی نے حسب سابق میاں جی کی طرف دیکھا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے تاکہ غور سے اگلی باتیں سن سکوں۔ اپنی اس غیر اخلاقی حرکت پر میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور میں وہیں کھڑی رہی۔

وہ لوگ کسی ''بھٹی صاحب'' کا ذکر کر رہے تھے جو ابو کے دفتر کا نیا افسر تھا اور نہ تو خود رشوت کھاتا تھا نہ ہی کسی راشی کو برداشت کرنے پر آمادہ تھا۔ اس نے صاف صاف سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس سے پہلے جو کچھ کر چکے ہیں وہ خدا اور ان کا معاملہ ہے۔ آئندہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے گا اور معمولی سی بے ضابطگی پر بھی کڑی سزا ملے گی۔

یہ بھٹی صاحب اپنی سخت گیری اور ایڈمنسٹریشن کے لئے خاصی شہرت رکھتا تھا اور اسے عموماً حکومت ان دفاتر میں بھیجا کرتی تھی جہاں بے ضابطگیاں اپنے عروج پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی گفتگو نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد میں نے جس قسم کی شہوت ناک گفتگو سنی اس کا بیان دنیا بھر کے مہذب ترین الفاظ میں بھی ناممکن ہے۔

اس سے پہلے مجھے اپنی ماں پر شک رہتا تھا آج مجھے اس سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ زانیہ تھی۔ مجھے اس لمحے اس بات پر رونا آ رہا تھا کہ ایسی گھٹیا عورت کے بطن سے میں نے جنم کیوں لیا؟ آخری فقرہ جو میری سماعت سے ٹکرایا وہ یہ تھا۔

''میاں جی! عقل کرو۔ میں کوئی بھاگی جا رہی ہوں۔ وہ لوگ آنے والے ہوں گے''۔

اس کے بعد وہاں کھڑے رہنے کا حوصلہ مجھ میں نہ رہا۔ میری ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پاؤں جن پر چل کر میں چارپائی تک پہنچی تھی میرے پاؤں ہرگز نہ تھے۔ شاید کسی نادیدہ ہستی نے مجھے سہارا دے کر وہاں تک پہنچایا تھا۔ شرم اور غصے کے مارے میں مری جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اٹھ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں پھر خودکشی کر لوں تاکہ یہ کہانی بھی میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے۔

لیکن...... ایک مجبور اور بزدل لڑکی ایسی باتیں صرف سوچا کرتی ہے۔ ان پر عمل اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ کاش میں نے اس لمحے اپنے اس خیال کو کسی طرح عملی جامہ پہنا لیا ہوتا تو آج خدا کی عدالت میں سرخرو ہو کر پیش ہوتی۔ آج زندہ درگور جہنم کے دہانے پر کھڑی ہو کر آپ سے باتیں نہ کرتی۔

☆☆☆

مجھے ہوش اس وقت آیا جب عابدہ نے قریباً مجھے جھنجھوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔

''کہاں پہنچ جاتی ہو تم آج کل۔ میں کسی کے باپ کی نوکر نہیں کہ سارے کام میں ہی کرتی رہا کروں''۔

میں نہ جانے کب سے سرہانے میں سر دیے رو رہی تھی۔ اپنی آنکھیں مجھے جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ عابدہ کی طرف میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

''خیریت تو ہے''۔ اس نے میری حالت دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ تم میری بہن اکیلی کام کرو۔ کسی لڑکی کو

HBC
urdufans.com

مدد کے لئے بلالو"۔

"ایک تو تمہاری طبیعت بڑی نازک ہے۔ہم تو جیسے انسان ہی نہیں"۔

بڑبڑاتی ہوئی وہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔

عابدہ نے کھڑکی کھول کر آصف کی بہن فرزانہ کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔

مجھے فرزانہ کے بلانے پر افسوس ہوا۔اس گندے گھر میں کسی باکرہ کا آنا جانا مجھے کیسے گوارا ہوتا؟ لیکن کیا کہتی۔کس سے کہتی؟

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ساری منڈلی اکٹھی ہوگئی۔وہ لوگ بھٹی صاحب کے معاملے پر ہی بحث کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے کہ اسی کی وجہ سے بھٹی صاحب کو ان سب پر شک گزرا ہے۔ان کے درمیان اس حرامخور میاں جی کو لیڈر کی حیثیت حاصل تھی۔امی اس ساری گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔والد تو سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔ان کی وکالت میری امی ہی کر رہی تھیں۔

رات گئے تک وہ لوگ وہیں جمع رہے۔پھر دفع ہوگئے۔

اس دوران فرزانہ میرے پاس کئی مرتبہ آئی۔وہ مجھے بڑی محبت سے باجی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔شاید آصف نے اسے اعتماد میں لے لیا تھا لیکن میری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔میں تو اس کی گفتگو بھی بڑی بددلی سے سن رہی تھی اور جواب میں صرف "ہوں" "ہاں" کہہ کر رہ جاتی۔

"معاف کیجئے باجی! میں شاید آپ کو بور کر رہی ہوں"۔

بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"ارے نہیں! دراصل میری طبیعت ذرا خراب ہے۔اس لئے......"

میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

"بھائی جان بیچارے تو بڑے پریشان ہوں گے آپ کی طبیعت کا سن کر"۔

اس نے میرے کان میں سرگوشی کی اور مسکراتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

ایک مردہ سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آصف نے واقعی اسے اعتماد میں لے کر اپنی اور میری محبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ عموماً ایسی معصوم محبتوں کا آغاز یوں ہی ہوتا ہے۔

خط لکھے جاتے ہیں۔ انگوٹھیاں، رومال اور خوشبوئیں نذر کی جاتی ہیں۔ چوری چھپے پارکوں اور سینماؤں میں ملا جاتا ہے۔ باہمی رابطے کے لئے کسی ایک شخصیت کو اعتماد میں لیا جاتا ہے جو عموماً ہیرو یا ہیروئن کی بہن ہوتی ہے!

شاید آج سے ہزاروں سال پہلے جو لوگ محبت کرتے تھے انہوں نے بھی یہی طریق کار اختیار کیا تھا اور صدیوں سے یہ راز سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آ رہا تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اپنے خیالات کے دھارے کا رخ آصف کی سمت موڑ کر اذیت ناک سوچوں سے فرار کی کوئی راہ ڈھونڈوں، لیکن فرار کی راہ نصیب نہ تھی۔

رات کا کھانا کھائے بغیر میں اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ساری رات کربناک سوچیں مجھے ڈستی رہیں۔ کبھی جی چاہتا ابو کو سارے حالات ایک خط کے ذریعے لکھ کر بتا دوں اور خود کشی کر لوں۔ کبھی دل چاہتا کہ ہنڈیا میں زہر ملا دوں اور ہم سارے اسے کھا کر مر جائیں لیکن میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پائی۔ بالآخر جس فیصلے نے مجھے مطمئن کیا وہ خاصا مثبت تھا۔

میں نے سوچا اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابو کو امی کے کرتوت کا علم نہ ہو۔ جب وہ خود کئی مرتبہ رات گئے شراب کے نشے میں دھت دوسروں کی بہو بیٹیوں سے منہ کالا کر کے گھر لوٹتے تھے تو امی کے متعلق انہیں کیا غلط فہمی ہوتی؟ وہ خود امی کو اپنے افسران کی خدمت میں سفارش کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ اس لئے ان سے بات کرنا بے سود تھا۔ تایا جی جو کبھی کبھی آیا کرتے تھے، وہ میری صرف اخلاقی مدد ہی کر سکتے تھے۔ میرے سامنے

HBC ans.com

صرف ایک ہی راہ تھی کہ میں جی جان سے محنت کروں، جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑے آصف کا ہاتھ تھاموں اور اس گھناؤنے ماحول سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کر جاؤں۔

آصف پر اتنی جلدی اعتماد کرنا بھی عجیب سی بات تھی لیکن انسان جو ہمیشہ خوش فہم رہا ہے خود کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی ڈھکوسلا کوئی بہانہ بھی تراش ہی لیتا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آصف مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ زندگی بھر میرے قدموں سے قدم ملا کر چلے گا۔ یہ ضرور تھا کہ فی الحال اسے اعتماد میں لینا غلط تھا۔

اس فیصلے پر پہنچ کر میں گہری نیند سو گئی۔ صبح جب مؤذن نے خدا کی عظمت کا اعلان کر کے اور نماز کو نیند سے بہتر بتا کر فلاح کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی تو میں نے اٹھ کر اس مالک کائنات کے حضور سجدہ شکر گزارا اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعا گو ہوئی کہ مولا! اب تو ہی میری راہنمائی کر۔ میرے ماں باپ کی خطاؤں سے درگزر فرما کر انہیں صراط مستقیم پر چلا اور میری معصوم بہن کو اس غلیظ ماحول سے محفوظ رکھ۔

نماز پڑھ کر میرا دل خاصا ہلکا ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی بہن ہونے کے ناطے اس بات کا عہد کیا تھا کہ عابدہ کو حتی الوسع کوشش کر کے ماں کے چنگل سے نکالوں اور کوشش کروں گی کہ اس کے سیر سپاٹوں میں کمی آ جائے۔

صبح میں نے کھڑکی کھول کر اپنے محبوب کے درشن کئے اور اسے نوید دی کہ آج میں داخلہ فارم لینے جا رہی ہوں۔

ناشتہ کر کے میں تیار ہو کر چل دی۔ بازار کے ایک کونے میں آصف میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ بڑی ہوشیاری سے ہم ایک دوسرے سے بظاہر لاپرواہ ایک دوسرے کی دھڑکنوں پر چلتے چلے جا رہے تھے۔

کالج کے بس سٹاپ پر اتر کر وہ بے دھڑک میرے نزدیک آ گیا۔

urdufans.com

''میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔فارم لے کر آ جاؤ''۔

اس نے میرے نزدیک آ کر کہا۔

میں نے چاہا ''نا'' کر دوں لیکن یہ صرف ذہن کا فیصلہ تھا دل کا نہیں۔ دل تو جانے کب سے آصف کے سنگ بیٹھ کر اس سے زمانے بھر کی باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ میں مسکرا دی اور وہ باہر رک گیا۔

☆☆☆

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ایک رکشہ میں بیٹھ کر ایک ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔خدا جانے آصف نے پہلے ہی سے یہ ہوٹل تاڑ رکھا تھا یا اسے معلوم تھا کہ ہم جیسوں کے لئے اس شہر میں یہی گوشہ عافیت ہے۔

رکشہ میں شرم کے مارے میں دہری ہوئی جا رہی تھی۔زندگی میں کسی غیر مرد کے نزدیک بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔آصف بولتا رہا۔میں سنتی رہی۔ مجھے یہاں بھی یہی خوف دامن گیر تھا کہ رکشہ والا شیشے میں ہم دونوں کو باتیں کرتے دیکھ رہا ہوگا۔

''بایو ہیون'' چھوٹا سا سنیک بار تھا۔اس کے خوابناک ماحول میں بیٹھ کر آصف نے مجھ سے جی بھر کے باتیں کیں۔اس نے اپنا سارا ذخیرۂ الفاظ میری تعریف میں خرچ کر ڈالا۔اس نے مجھے یقین دلایا کہ سوائے موت کے اور کوئی طاقت اس کے اور میرے درمیان دیوار نہیں بن سکتی۔اس کے ایف ایس سی کے امتحانات ہونے والے تھے۔وہ اپنی اعلیٰ پوزیشن کے لئے بڑا پر اعتماد تھا۔

اس روز اس کی شخصیت سے متعلق دو باتیں میرے ذہن میں گھر کر گئیں۔

پہلی تو یہ کہ وہ کوئی عام قسم کا لونڈا نہیں۔خصوصی اہمیت کا حامل لڑکا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کا مستقبل بہت روشن بہت تابناک ہے۔اس نے مجھے ایف ایس سی میں

رکھنے والے مضامین اور ان کی باریکیوں سے آگاہ کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ میرے ڈاکٹر بننے کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ اپنی سی کوشش کر گزرے گا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب ہم ہوٹل سے باہر آئے تو میں نے کل کے سارے واقعات بھلا دیئے تھے۔میں خود کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی تصور کر رہی تھی۔اعتماد کی دولت سے مالا مال میرا ہر قدم گھر کی سمت ایک نئے عزم اور ولولہ تازہ کے ساتھ اٹھ رہا تھا۔

ہوٹل سے کچھ دور ایک بس سٹاپ پر پہنچ کر ہم الگ الگ ہو گئے۔

ہم نے اگلی ملاقات کے لئے ابھی سے منصوبہ بندی کر لی تھی۔مختلف اشارے مقرر کر لئے تھے۔آصف نے بتایا فرزانہ اس کی بہت پیاری بہن ہے اور اس نے اسے اعتماد میں لے لیا ہے۔فرزانہ اس کے اس فیصلے پر بہت خوش ہے۔وہ تو خود بھی چاہتی تھی کہ اس کا بھائی اپنے جیسی لائق فائق لڑکی کو جیون ساتھی بنائے۔

گھر پہنچی تو قیامت ٹوٹ گئی۔

''باجی! باجی! ہم لوگ تھوڑے دنوں تک نشاط پورہ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ہائے اللہ ابو نے بڑی خوبصورت کوٹھی کرائے پر لی ہے۔شکر ہے خدایا! اس ذلیل مکان سے تو نجات ملے گی......''

عابدہ نے مجھے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا۔

وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔

اللہ کسی کی محبت کو یوں نظر نہ لگا کرے۔آغاز سفر ہی میں کوئی یوں نہ لٹے جیسے میں لٹی۔جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب ہمارا سفر آغاز ہوا۔ابھی تو طویل مسافتوں کی سمت ہم نے قدم اٹھائے ہی تھے۔راہ محبت میں ابھی تو مجھ سے پہلا باقاعدہ گناہ ہی سرزد ہوا تھا۔یہ ایک ملاقات کی اتنی مہنگی قیمت۔یہ چند پل کی خوشیوں کا اتنا مول۔کیسا انصاف مالک

HBC
urdufans.com

...ہ کی بات سنتے ہی میری تمام حسیات کو موت آ گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے
...ے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ کالج کا داخلہ فارم ہاتھوں میں پکڑے کانپ گیا۔
...تے قدموں سے میں اپنے کمرے کی طرف چلدی اور بے دم سی ہو کر بستر پر جا گری۔
...انسوں کا تانا بانا منتشر ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

چار پائی پر لیٹے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چھت زمین پر اور زمین چھت پر آ رہی ہے۔ جیسے نظام حیات کے تمام سیارے اپنے مدار سے ہٹ کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔ ایک آگ سی بدن میں پھیلنے لگی۔ ہائے اولین محبتوں کا خمار۔ کیسی مبارک ساعتیں ہوتی ہیں وہ ان دکھوں میں بھی کیسی لذت اور کیا سرور ہوتا ہے۔

...پہر ہو رہی تھی دل بھر آیا۔ پھانس سی گلے میں اٹک گئی۔ میں بے سدھ ہو کر لیٹ رہی۔ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ شام گئے آنکھ کھلی تو جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ عابدہ ...ے ساتھ ایک ڈاکٹر کی دکان پر گئی۔ اس نے انجکشن لگا کر دوائی اور گولیاں پلے باندھ دیں۔ ...گولیوں نے معدے تک پہنچتے ہی مجھے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

...تی اٹھی جب آنکھ کھلی تو جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ طبیعت میں ...ذرا سکون سی تھی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور خالق کے حضور روتے ہوئے ہاتھ پھیلا ...یے۔ ... میری ... لڑکی کو چاہا تھا تو ابتدا ہی میں جدائی مقدر ہو گئی تھی۔ نماز کے بعد ...طبیعت ... ہلکی ہو گئی۔

...شتے سے فراغت پاتے ہی امی اور عابدہ کے روکنے کی پرواہ کئے بغیر "فارم ... ... روانہ ہو گئی۔ آصف پروگرام کے مطابق کالج کے باہر میرا منتظر تھا۔

فارم جمع کروا کر میں باہر آ گئی۔ رکشہ میں تو میں نے ضبط کئے رکھا لیکن جیسے ہی ہم ہوٹل کے کیبن میں بیٹھے پیمانہ صبر چھلک گیا۔ میرے لاکھ ضبط کے باوجود آنسوؤں کا تیز دھارا پھوٹ نکلا۔ اپنی ہچکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے میں نے آصف کو "ہجرت" کی خبر سنائی۔

پہلے تو اس کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پالیا۔ شاید وہ میرے سامنے بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور خود بھی سوگوار ہو کر میرا حوصلہ توڑنے سے گریزاں تھا۔

"پگلی! اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ نشاط پور یہاں سے کتنی دور ہے۔ میں روزانہ تم سے ملا کروں گا۔ آخر تم کالج تو آیا کرو گی"۔

اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ پھر زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔ "حضور! اگر کہیں تو گھر کے سامنے دھونی لگا کر بیٹھ جاؤں"۔

میں بے اختیار مسکرا دی۔

آنسوؤں سے بھیگی وہ مسکراہٹ کیسی ہو گی؟ یہ تو میں نہیں جانتی لیکن وہ لمحے سرمایہ حیات بن گئے ہیں۔ اگر یہ مقدس یادیں بھی میرا زاد راہ نہ ہوتیں تو جہنم کے یہ ریگزار جو آج میں پاٹ چکی ہوں کبھی کی ان کے درمیان ہی کہیں بھسم ہو کر رہ جاتی۔ جانے کیسی کیسی عذابناک بستیوں سے گزری ہوں میں۔ کیسی کیسی المناک گھڑیاں بیتی ہیں مجھ پر لیکن میں نے ان مقدس امانتوں کو وقت کی آندھیوں، بگولوں، طوفانوں سے ہمیشہ بچا کر رکھا ہے۔ اپنے جی جان سے بڑھ کر ان کی حفاظت کی ہے میں نے۔

آصف نے مجھے امید دلائی کہ وہ کبھی ان باتوں کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ کبھی ایسی مجبوریاں کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنیں گی۔ اس نے مجھے دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کی اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اپنا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا کروں گی۔

HBC
urdufans.com

میں ڈولی میں نہیں بیٹھی۔ سہاگن نہیں بنی میں۔ میرے سپنوں کو ایک ایک کر کے موت آئی ہے۔ میرے ہاتھوں میں کبھی مہندی نہیں رچی' لیکن مجھے علم ہے رخصتی کے وقت دلہنوں پر کیا گزرتی ہے۔ بابل کے آنگن سے جدائی کے سمے نینوں سے کیسے ساون کی جھڑیاں لگتی ہیں۔

میں شہر والے مکان سے رخصت ہوتے ہوئے فرزانہ سے لپٹ کر بری طرح روئی تھی۔ اس کھڑکی کی سلاخوں کو جن سے گزر کر آصف کا پیام محبت مجھ تک پہنچا تھا۔ چوم چوم کر آنسو بہائے تھے میں نے۔ اپنے بوسیدہ کمرے کی ایک ایک دیوار سے لپٹ کر میں نے اپنے لٹنے کی دہائی دی تھی۔

''باجی! میں آپ سے ملنے آیا کروں گی''۔

فرزانہ نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''ضرور آنا فرزانہ! مجھے بھول نہ جانا''۔

میں نے سسکی لی۔

''آپ کو کوئی بھول نہیں سکتا باجی! آپ بہت پیاری ہیں۔ بہت اچھی ہیں''۔

فرزانہ نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''ہم آپ کو دلہن بنا کر واپس لائیں گے باجی!''

اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میرا دل بھر آیا۔

☆☆☆

نشاط پورہ نودولتیوں کی آبادی تھی۔ نئی کالونی۔ نئے لوگ۔ نئی قدریں۔ نئی بستیاں۔ بالکل الگ ماحول تھا شہر سے یہ۔ میری ماں نے فریج' فریزر تو خیر سے رکھا ہوا تھا۔ یہاں پہنچی تو سب سے پہلے گھر میں اس مسئلے پر ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ٹیلی ویژن پرانا ہے

چینل بہت کم آتے ہیں۔ ڈش بھی لینی ہے۔

رنگین ٹیلی ویژن آ گیا۔ ڈش لگ گئی۔

نیا فرنیچر آ گیا۔

پردے بدل گئے۔

نئی کٹلری آ گئی۔

فرمائشیں بڑھنے لگیں۔ والد صاحب کے ہاتھ لمبے ہوتے گئے۔ دولت کا زور بڑھنے لگا۔ انہوں نے یہ بات جیسے بھلا ہی دی کہ بھٹی صاحب کی شکل میں ننگی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی ہے جو کسی بھی لمحے ان پر گر سکتی ہے۔

میں نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے تیسرے روز آصف سے ملاقات ہونے لگی۔ ہم نے پتھروں اور درختوں پر اپنے نام لکھنے شروع کر دیئے۔ دریا کنارے زمین پر دل بنا کر اس کی دھڑکنوں میں دونوں کو سمونے لگے۔ ہم ان کنجوں میں گھومنے لگے جہاں کوئلیں سندھیا کے گیت گاتی ہیں۔ ہم نے دریا کی لہراتی بل کھاتی لہروں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کے سنگ سنگ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ باغوں میں دوڑتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ''اک مک'' رہنے کے پیمان باندھے۔

درختوں کی اوٹ میں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو شمار کیا لیکن ہمارے پیار کے تقدس کی انتہا تھی کہ کبھی آصف نے میرے لب لعلیں کی مسکراہٹ چرانے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہماری محبت طوفانی' لافانی اور زندہ جاوید تھی۔

آصف ہر ملاقات پر مجھ سے تعلیمی رپورٹ طلب کرتا۔ ٹیسٹ میں آنے والے نمبروں کا جائزہ لے کر ہدایتیں دیتا۔ جب میں نے فرسٹ ایئر پاس کیا تو اس کا بھی رزلٹ نکلا اور میرا محبوب اپنے کالج میں ٹاپ کر گیا۔

''یہ سب تمہاری دعاؤں کا ثمر ہے۔ تمہاری محبت کا اثر ہے۔ تم میری کامیاب زندگی کا آغاز ہو۔ تمہیں پا کر میں زندگی کے ہر میدان میں سرخروئی حاصل کروں گا۔ تم میرے عزم کو مہمیز لگاتی ہو۔''

اس نے اس روز بے اختیار مجھے اپنی دھڑکنوں میں سموتے ہوئے کہا۔

میں خود کو کسی اور عالم کی مخلوق جان رہی تھی۔ کتنی خوش تھی میں۔ گھر سے اس دوران میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے کبوتر بلی کے خطرے سے بند کرتا ہے۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ آصف تھا' کالج تھا یا کتابیں تھیں۔ گھر میں کون آیا؟ کون گیا؟ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ مجھے تو اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ اس ''مہذب آبادی'' میں آ کر امی نے پر پرزے پھیلانے شروع کر دیئے ہیں اور اب انہیں اپنی ''خاندانی صلاحیتوں'' کے عطا کردہ جوہر کھل کر دکھانے کے لئے صحیح میدان میسر آ گیا تھا اور ان کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے۔

ہمارا گھر کالونی کے تمام نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے پناہ گاہ بنتا جا رہا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بہانے کوئی تقریب برپا کر کے امی ان لوگوں کو آپس میں کھل کر ملنے کے مواقع فراہم کرتیں اور اس کے بدلے میں ان سے تحائف وصول فرما لیتیں۔ کسی کو شک نہ گزرتا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جوڑا کسی نہ کسی بہانے سے ہمارے ہاں آ جاتا۔ امی بڑی تیزی سے اپنی اصل کی طرف لوٹ رہی تھیں۔

اس روز پھر ایک خاص میٹنگ ہمارے گھر پر منعقد ہوئی۔ ایک کلرک رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اس نے پولیس کے سامنے سب سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس پر آنچ بھی آئی تو وہ سب کو بھسم کر کے رکھ دے گا۔ اس بے چارے تک تو بمشکل پندرھواں بیسواں حصہ پہنچتا تھا۔ کھاتے تو بڑے افسران تھے۔ اس نے للکارتے ہوئے کہا تھا کہ وہ سارے گروہ کو

BBC
urdufans.com

گرفتار کروائے گا۔ اس بات نے سب کی نیند حرام کر دی تھی۔

سب کا بلڈ پریشر گھٹنے بڑھنے لگا تھا۔ ان کی منحوس صورتوں پر لعنت برسنے لگی تھی۔ سب کو اپنے بچاؤ کی فکر نے گھن لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس روز اس چنڈال چوکڑی کا گرو گھنٹال میاں جی بھی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی جان کو رو رہے تھے۔ سب بری طرح پھنسنے والے تھے۔

شاید قانون قدرت حرکت میں آ گیا تھا۔ ان پر حد نافذ ہونے والی تھی۔ کوئی دم جاتا تھا کہ انہیں جوابدہی کے لئے کٹہرے میں جانا پڑتا۔

میرے والد کی تنخواہ سے زیادہ ہمارے مکان کا کرایہ تھا۔ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ الگ تھے۔ والدہ کے چاؤ چونچلے نوابزادیوں سے کم ہرگز نہیں تھے۔ یہ سارا دھندہ جو چل رہا تھا تو پیسے کے سر پر۔ اتنا بے تحاشہ پیسہ یونہی تو نہیں آ جاتا۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار مچا رکھی تھی ان لوگوں نے۔ لیکن اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

سوائے میری امی کے باقی سب کو جیسے موت آ گئی تھی۔ ایک انکی آواز میں طنطنہ تھا۔

''نیاز محمد! گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں خود ملوں گی تمہارے اس بھٹی صاحب سے''۔

ان کے دفع ہوتے ہی امی نے والد سے کہا۔

''وہ تیرے بس کی بات نہیں زہراں! سفارش کا تو اس پر الٹا اثر ہوتا ہے''۔

ابو نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

''تو گھبراتا کیوں ہے۔ میرے پاس ایسی ایسی سفارش رکھی ہے کہ بڑے بڑے صوفیوں کا ایمان ڈگمگا جائے''۔

HBC
urdufans.com

والد: نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

اس ''ایسی ایسی سفارش'' کا مطلب ابو کی تو سمجھ میں آیا ہو یا نہیں؟ میں بخوبی جان گئی۔

یہ وہ بد بخت اور معصوم لڑکیاں تھیں جو ''آنٹی'' کو دوست جان کر اپنے دوستوں کے ساتھ اس کے ہاں آیا کرتی تھیں۔ ان کی کمزور رگیں میری ماں کے ہاتھ میں تو تھیں۔ جب چاہتی کسی کو بھی بلیک میلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ڈھب پر لے آتی اور! اس نے ایسا کیا بھی۔ یہ الگ بات کہ منہ کی کھائی۔ بھٹی صاحب نے میری ماں اور اس کی ''بھانجی'' کو جھڑکیاں دے کر گھر سے نکال دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ والد صاحب کی نگرانی اور سخت ہوگئی۔

میاں جی کے کہنے پر ساری چنڈال چوکڑی محتاط ہوگئی تھی لیکن یہ کافرمنہ کو لگی ہوئی چھٹتی کہاں ہے۔ ایک روز جب والد کی رال ٹپکی تو بھٹی صاحب نے ہاتھ ڈال ہی دیا۔ اگلے روز انہیں محکمانہ تحقیقات کے خاتمے تک معطل کر کے گھر بھیج دیا گیا تاکہ غیر جانبدارانہ تفتیش پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کریں۔

اس روز والد گھر آئے تو میں یہ دیکھ کر پریشان ہوگئی کہ وہ ذرہ برابر گھبرائے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''زہراں! ایک در بند تو سو در کھلے''۔ انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''اور کیا نہیں تو۔ دیکھوں گی اس ایماندار کی اولاد کو۔ بچو کو ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو زہراں نام نہیں''۔

والد: نے فلموں کے ولن کی طرح بڑے غصے سے کہا۔

اس روز ساری رات میاں بیوی بھٹی صاحب کو گالیاں دیتے رہے۔ اگلے روز علی الصبح میری آنکھ زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے کھلی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی جہاں ایک تھانیدار اور چار پانچ سپاہی والد صاحب کو گھیرے میں لئے کھڑے تھے۔

☆☆☆

HBC
urdufans.com

زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ پولیس کو دیکھتے ہی مجھے سارے معاملات کی سمجھ آ گئی تھی۔ محکمانہ تفتیش نے والد صاحب کو مجرم ثابت ہونے پر پولیس کیس کروا دیا تھا اور اب پولیس ملزم کو گرفتار کرنے آئی تھی۔ عابدہ تو ڈر کے مارے کمرے سے باہر ہی نہیں آئی تھی۔ والد کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، لیکن ایک ہستی ابھی تک مطمئن تھی۔

امی!

امی نے بڑے نرم لہجے میں ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

"ہم نیاز محمد کو گرفتار کرنے آئے ہیں"۔

تھانیدار نے نظروں ہی نظروں میں امی کو تولتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن کس جرم میں؟"

اس مرتبہ امی کا لہجہ ذرا سخت تھا۔

"جرم کا پتہ بھی تھانے جا کر لگ جائے گا"۔

تھانیدار نے پولیس کا لہجہ اختیار کر لیا۔

"آیئے آپ لوگ ڈرائینگ روم میں بیٹھئے"۔

امی ذرا ڈھیلی پڑ گئیں۔

"نہیں، نہیں! چلو تم تھانے چلو"۔

اس نے والد کو اشارہ کیا۔

ایک حوالدار اپنی بیلٹ سے منسلک ہتھکڑی کھولنے لگا۔ میرے گرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ حلق خوف اور شرمندگی کے مارے خشک ہو رہا تھا۔ اگر میں چیخنا چلانا بھی چاہتی تو چلا نہ پاتی۔ احساس ندامت نے مجھے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ لیکن یہ صرف میری حالت تھی۔ میری ماں کا دم خم وہی تھا۔

"آیئے جی! بیٹھئے تو سہی"۔

اس دفعہ انہوں نے خالص بازاری لہجے میں تھانیدار کو مخاطب کیا تھا۔

ان لہجوں اور زبانوں کے پیچھے چھپے مطالب کا گیان پولیس سے زیادہ اور کسے ہو گا۔ وہ تو ایسی چیزوں کے منتظر رہتے ہیں۔

تھانیدار نے پولیس والی نظروں سے پہلے امی کی طرف پھر منہ پھیر کر کونے میں کھڑی میری طرف دیکھا۔ شاید وہ امی کے "اتا پتے" جانچ رہا تھا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور اپنے نیم مردہ وجود کو گھسیٹتی کمرے میں واپس چلی گئی۔ تھانیدار نے سپاہیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور امی اور ابو کے ساتھ اندر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا۔ میرے کمرے میں عابدہ بھی سکڑی ایک کرسی پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ "باجی" کہہ کر میری طرف لپکی اور ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر رونے لگیں۔

قریباً چار منٹ بعد اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ امی بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔

"کون مر گیا ہے تمہارا"۔

انہوں نے غصے سے کھولتے ہوئے ہمیں ڈانٹ پلائی۔

urdufans.com

ایک بیٹی کے منہ سے یہ بات آپ کو عجیب تو لگے گی۔ آپ مجھ سے نفرت تو کریں گے کیونکہ آپ کے پاس کہنے کے لئے ایک بات بہرحال موجود ہے کہ کچھ بھی ہو وہ میری ماں تو تھی۔ لیکن اب میں منافقت نہیں کروں گی۔ سچ سچ سب کچھ کہہ دوں گی۔ اس لئے میرا خون غصے سے ابلنے لگا۔ میرا جی چاہا آگے بڑھ کر اس عورت کا منہ نوچ لوں جو بدقسمتی سے میری ماں بھی تھی۔

"چابی کہاں ہے سیف کی؟"

امی نے عابدہ کو مخاطب کیا۔

"میرے سرہانے کے نیچے رکھی ہے۔"

عابدہ روتے ہوئے کہا۔

"چپ کر جا الو کی پٹھی!"

امی نے ہمیں صلواتیں سناتی چلی گئی۔

میں روتے روتے چپ ہو گئی۔ ایک عجیب طرح کی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ مجھے بجائے ندامت کے غصہ آنے لگا۔ امی پر' ابو پر' عابدہ پر اور سب سے بڑھ کر خود پر۔ "کیا میں واقعی بزدل ہوں"؟ میں نے سوچا۔

☆☆☆

پولیس والے خالی ہاتھ اور بھری ہوئی جیبوں سے رخصت ہو گئے۔ امی بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکل گئی تھیں اور والد صاحب گھر ہی پر رہے۔ ان سب کے رخصت ہوتے ہی انہوں نے ہمیں ننگی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ انہیں اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر ہم والدین کو اکیلا چھوڑ کر رونے دھونے میں کیوں مصروف ہو گئی تھیں۔

انداز فرمایا آپ نے! یہ تھے ہمارے والدین۔ دادی کی تربیت نے مجھے پاکیزہ

اور باکردار رہنا سکھایا تھا۔ لیکن صرف زبانی تربیت دی تھی۔ کوئی تعویز گھول کر میرے اندر نہیں ڈالا تھا کہ یہ نظریات میرے خون میں گردش کرنے لگتے۔ میری رگوں میں میرے باپ کا خون تھا۔ رنگ بھی انہی کا چڑھنا چاہئے تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ میرے سوچنے کا انداز منفی ہوا۔

بغاوت کا خفتہ آتش فشاں میرے دل و دماغ میں کب سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ لاوا پک چکا تھا۔ آج اسے پہلی مرتبہ بہنے کی راہ نصیب ہوئی۔ جانے کب سے اپنے اندر انگڑائیاں لیتی دادی اماں کو میں تھپکیاں دے کر سلا رہی تھی۔ بالآخر وہ سو گئیں۔ اب میرے اندر میری ماں بیدار ہو گئی تھی اور یہی میری بربادی کا آغاز تھا۔

میرے ذہن میں بغاوت کا جو سانپ کلبلانے لگا تھا اس نے سب سے پہلے مجھے ہی ڈسا۔ میں اپنے زہر کا پہلا شکار بن گئی تھی۔

وہ بیٹیاں جنہیں بے غیرتی کے خوف سے لوگ زندہ درگور کر دیا کرتے تھے بڑی خوش قسمت ہوں گی۔ مجھے تو ہوس کے مارے والدین نے مرنے سے بچا کر اپنے ہاتھوں زندگی کے جہنم میں جھونکا تھا۔ میں حرص و ہوا کے لپکتے شعلوں سے کب تک اپنا دامن چھڑاتی۔ کہاں تک خود کو جھلسنے سے محفوظ رکھتی۔ آخر کو میری حیثیت تھی کیا؟

ایک ناتواں بے کس لڑکی۔

میرے ذہن میں پہلی بات یہ آئی تھی کہ نیکی صرف ڈکشنری میں لکھا جانے والا لفظ ہے۔ عملی زندگی میں اس کا وجود ہوتا تو آج پولیس خالی ہاتھ کیوں جاتی؟ جب ثبوت مل گیا تھا تو ملزم کے بچ جانے کا جواز کیا تھا؟

میری پاکیزگی خون ہونے لگی۔ میں نے سوچا یہاں تو جس کی لاٹھی ہو گی وہی بھینس ہانک کر لے جائے گا۔ مکافات عمل کا وجود یقیناً ہو گا لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ

ABC
urdufans.com

رہی تھی۔

صبح کالج پہنچی تو میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ مارشل آرٹس سکھانے والی ٹیم کے سامنے پیش ہوگئی۔ یہ ٹیم ہمارے کالج میں لڑکیوں کو ایک خصوصی کورس کروانے آئی تھی۔ اس حرکت کا محرک بظاہر تو انتقام کا جذبہ ہی تھا لیکن کس سے؟ اس بات کی مجھے سمجھ نہ آسکی۔

اصل میں جب میرے ذہن نے طاقت کے وجود کو تسلیم کرلیا تو یہ تحریک خود بخود میرے اندر پیدا ہونے لگی کہ یہ دنیا کمزوروں کے لئے نہیں۔ نہ ہی معاشی معاشرتی طور پر کمزور لوگوں کے لئے اور نہ ہی جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے لئے۔

اپنی نسوانیت پر یہ میرا پہلا بھرپور حملہ تھا۔

میرا آغاز ہی بڑا تیز اور جذباتی تھا۔

پہلے روز جب ایک بلیک بیلٹ جو نجانے کتنے ''ڈان'' تھا۔ جس کے چہرے کی بناوٹ ہزاروں سال پرانے تبتی لاماؤں سے ملتی جلتی تھی نے مجھے کھڑے کھڑے ہاتھ جھکا کر زمین چھونے کو کہا اور میں نے جھٹ سے وہ عمل کر دکھایا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ویل ڈن۔ تم آگے نکلو گی''۔

آگے نکلنے کا یہ پہلا قدم تھا۔ آج میں جہاں پہنچ چکی ہوں اس سے آگے کوئی اور راستہ نہیں جاتا۔

اس چوراہے تک پہنچ کر ہر سمت میں صرف پسپائی باقی رہ جاتی ہے۔ آگے صرف موت ہے موت۔ اور موت ہی کبھی کبھی نجات کی واحد راہ رہ جاتی ہے۔

وہ لوگ جو دن میں دو تین مرتبہ حالات کے ہاتھوں مرنے کی آرزو کرتے ہیں اپنی نیت میں پرخلوص ہوتے ہیں لیکن مرنے سے پہلے آدمی جس دہشت ناک موت کا تصور

ذہن میں باندھ لیتا ہے اس کے بعد مرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

پہلے روز جب میری سہیلیوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے ''مارشل آرٹس'' سیکھنے شروع کردیئے ہیں تو انہوں نے حیرت سے خبر سنانے والی کو دیکھا اور اس وقت کسی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا جب تک مجھے اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ کرتے دیکھ نہیں لیا۔

''پاگل ہوگئی ہے''۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا''۔

''جب تین چار روز بعد ہڈیاں تڑخنے لگیں تو صاحبزادی کو دیکھیں گے''۔

''کمال ہے اتنی ایگریشن۔ یا تو بھیگی بلی بنی بیٹھی رہتی تھی''۔

مختلف لوگ' مختلف زبانیں' مختلف ریمارکس۔ لیکن ایک عزم تھا کہ ثابت قدم رہا۔

☆☆☆

امی کی واپسی اسی خبیث میاں جی کے ساتھ ہوئی تھی اور ان کے ہاتھوں میں ضمانت نامہ تھا۔ انہوں نے ابو کی قبل از گرفتاری ضمانت منظور کروائی تھی۔

''بچے ہیں اپنے۔ کس کی ہمت ہے جو اس شہر میں رہ کر میاں کی بات ماننے سے انکاری ہو''۔

اس نے میرے والد کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میاں جی! ہم بھی سب بات سمجھتے ہیں''۔

والد کا لہجہ اس لمحے بڑا گھناؤنا تھا۔ ''یوں ہی آپ کی چوکھٹ سے نہیں لگے''۔

''نیاز محمد! حوصلہ رکھ اگر تیرے بھٹی کا کونہ ٹھپ دیا تو اپنا ماں کا جنا نہ بتائیو''۔

مجھے کمرے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر وہ کچھ زیادہ ہی خرافات بکنے لگا۔

HBC
urdufans.com

عابدہ نے حسب سابق ان کے لئے چائے تیار کی۔ میری والدہ ایسی خوش نظر آ رہی تھی جیسے اس نے بڑا میدان مارا ہے۔ میاں اور اس کی آنکھوں میں لہراتی شیطانی چمک سے مجھے گھن آنے لگی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور مسہری پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''آصف کو اپنی اصلیت بتلا دوں''۔

اچانک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن پر لہرایا۔

''نا..... نا..... پگلی! کبھی بھول کر بھی یہ خیال دل میں نہ لانا۔ مرد ذات ہے۔ بدگمانی کا شائبہ تک اس کے دل میں پیدا نہ ہونے دینا''۔

عقل نے رہنمائی کی۔

''لیکن یہ غبار پھر چھٹے گا کیسے؟ کسی نہ کسی کو راز دار تو بنانا ہی ہوگا''۔

میں نے دلیل پیش کی۔

''خاموش ہو جا..... زبان اور ذہن کے سارے دریچے بند کر کے بیٹھی رہ۔ خبردار یہ تیری معمولی سی غلطی ساری زندگی کا روگ بن جائے گی'' عقل کی وارننگ ملی۔

اور !

میں نے واقعی سب کچھ بھلا دیا۔ میرے ذہن میں میرے تبتی لاماؤں جیسی شکل والے انسٹرکٹر کے الفاظ گونجنے لگے۔

''ویل ڈن۔ تم آگے نکلو گی''۔ اور احساس تفاخر سے میری گردن خود بخود تن گئی۔ میں نے تصور ہی تصور میں خود کو آسمانوں پر تیرتا جھولتے دیکھا اور اٹھ کر دوبارہ اپنے کمرے کے دروازے کے ہولٹ کا جائزہ لینے کے بعد وہی ورزش دہرانے لگی جس سے میرا واسطہ صبح پڑا تھا۔

جسم میں میٹھا میٹھا درد اٹھا تو بجائے کسلمندی کے مجھے مزہ آنے لگا۔ ذہن میں آنے والے تمام خیالات کو جھٹک کر میں نے خود کو ڈاکٹر، بہادر نجمہ اور آصف کی تکون میں پھنسا لیا تھا۔ میری زندگی اب ان تینوں زاویوں کا مجموعہ تھی۔ مجھے ڈاکٹر بننا تھا۔ مارشل آرٹس میں مہارت حاصل کرنا تھی اور آصف کو جیون ساتھی بنانا تھا!

رات دیر گئے تک میں اپنی دنیا میں مگن رہی۔ گھر میں ہونے والی سرگرمیوں سے بالکل لاپرواہ۔ گھر سے بیگانہ اور اپنے حال میں مست۔ رات بستر پر لیٹی تو آصف سے اگلے روز کی گفتگو کا خاکہ تیار کرنے لگی۔

اگلے روز حسب پروگرام کالج سے چھٹی پر آصف میرا منتظر تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ایک گوشہ عافیت اپنے لئے ڈھونڈ چکے تھے۔

''مجھے داخلہ مل گیا''۔

اس نے بیٹھتے ہی خوش خبری سنائی۔

''میں نے داخلہ لے لیا''۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

آصف نے حیرانگی سے میرے چہرے کی طرف دیکھا ''خیریت''

''ہاں بس یونہی ذرا CHANGE کے لئے''۔

مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔

''کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کیسی CHANGE؟ کہاں داخلہ لے لیا؟''

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''پاگل خانے میں''۔

میں نے بظاہر ہنستے ہوئے بات ٹالنا چاہی لیکن میری ہنسی کے کھوکھلے پن کو اس

HBC
urdufans.com

نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

"دیکھو نجمہ! مجھے پریشان نہ کرو۔ صاف صاف بات بتاؤ"۔

اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اسے مطمئن کروں۔ بات منہ سے نکال کر میں پھنس گئی تھی۔ کئی بہانے سوجھے لیکن آصف سے جھوٹ بولنے کو دل نہ چاہا۔

"مارشل آرٹس کی کلاس میں"......

میں نے چائے کا کپ بنا کر اس کی طرف کھسکایا۔

آصف نے اچانک اس طرح چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔

"میں سمجھا نہیں"۔

اس نے چائے کی پیالی میں چمچ گھماتے ہوئے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ایڈونچر......"

میں نے مختصر جواب دیا لیکن آصف کسی پنگھوڑے میں کھیلنے یا انگوٹھا منہ میں لے کر چوسنے والے بچے کا نام نہیں تھا۔

"نجمہ! میں نے اپنی زندگی کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ اس کے ورق ورق پر کیا لکھا ہے تم بخوبی پڑھ سکتی ہو۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی ہے۔ تمہارے گول مول جوابوں سے۔ کھل کر سب کچھ کہہ دو۔ مجھ سے چھپاؤ گی؟ یہ تمہارے لئے کیسے ممکن ہے نجمہ! ہم کوئی دو نہیں ہیں۔"

اس کا لہجہ خاصا گھمبیر اور مشفقانہ تھا۔

آصف کے لہجے میں اس لمحے جو درد چھپا تھا وہ مجھے رلا گیا۔ ذرا سی ہمدردی ملتے ہی میرے اندر کا زہر باد پھٹ گیا۔ آنسو حلق میں گرنے لگے۔ آنکھیں جلنے لگیں اور ایک پھانس حلق کے عین درمیان اٹک گئی۔ فرار کی کوئی راہ مجھے نظر نہیں آتی تھی۔ پھر رندھے ہوئے گلے سے میں نے اسے اول تا آخر ساری کہانی سنا دی۔

وہ سنجیدگی اور ہمدردی سے میری بات سنتا رہا۔ دوران گفتگو اس نے صرف دو مرتبہ مجھے ٹوک کر خود پر قابو رکھنے کی تلقین کی اور اس بات کا احساس دلایا کہ ہم "پبلک پلیس" پر بیٹھے ہیں' اپنے گھر کے ڈرائینگ روم میں نہیں۔

"نجمہ! اپنے آنسو پونچھ لو"۔

اس نے اپنا رومال میری طرف بڑھایا۔ پھر اسے تہہ کر کے کمال محبت سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"یہ رومال مجھے ہمیشہ تمہاری بے وقوفی کا واقعہ یاد دلاتا رہے گا"۔ وہ مسکرایا۔

"نجمہ! شاید تم اس بات کو جھوٹ سمجھو کہ مجھے ان حالات اور واقعات کا علم تھا۔ تم بخوبی جانتی ہو ہمارے اندرون شہر محلوں میں لوگ صرف دوسروں کے عیب پر نظر رکھتے ہیں۔ دوسروں کی کھوج لگانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس کافی فالتو وقت اس دلچسپ مشغلے کی نذر کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ تمہاری امی کا خاندان وہاں پچھلے بیس برس سے قیام پذیر ہے اور ان کے افسانے محلے گلی کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ تمہارے گھر میں روزانہ عجیب عجیب اور بیہودہ قسم کے لوگوں کی آمد اور تمہاری والدہ اور بہن کے نت نئے فیشن' غیر ملکی اشیاء کی بھرمار اور تمہارے والد کی کلرکی' یہ سب کچھ سب کی نظروں میں شروع سے تھا اور ہے۔ ایک تمہارے والدین کو یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ لوگ اندھے' بہرے اور گونگے ہیں اور جب انہیں احساس ہوا تو انہوں نے مکان بدلنے ہی میں عافیت جانی۔ تمہارا ذاتی کردار کیا ہے؟

HBC
urdufans.com

تمہارے متعلق میں اور فرزانہ کیا سوچتے ہیں' تم شاید اس کا تصور بھی نہ کر پاؤ۔ تم رتن جوت کا وہ پھول ہو جو گندگی کے ڈھیر پر پرورش پا رہا ہے۔ گلاب کی مہک کو موت نہیں آتی۔ اس کی خوشبو یہاں وہاں ہر جگہ امر ہے۔ زندہ ہے۔ تمہاری طرح تمہارے کردار کی طرح۔ تمہاری پاکیزگی کی قسم میں ہی نہیں ہمارے محلے کا ہر بچہ کھا سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک گزرنے لگتا ہے کہ تم واقعی ان لوگوں کی اولاد ہو......"

"نجمہ!"

اس نے بڑے جذباتی لہجے میں میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں یہ سب کچھ جاننے کے بعد دل و جان سے اپنایا ہے۔ میری محبت میں اتنی ہی سچائی ہے جتنی سورج کے کل صبح طلوع اور غروب ہونے میں ہے۔ مجھے علم تھا تم کسی روز مجھے اپنے دکھوں میں حصہ دار بناؤ گی۔ آج جب تم نے مجھے یہ کہانی سنائی ہے تو مجھے تم پر ہی نہیں خود پر بھی فخر ہونے لگا ہے کہ تم نے مجھے اس قابل جانا۔ نجمہ! یہ تو ممکن ہے کہ دنیا بھر کے سمندر خشک ہو جائیں۔ سورج کی روشنیاں اندھی پڑ جائیں۔ چاند ہمیشہ کے لئے گہنا جائے۔ سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ مجھے موت آ جائے میرا وجود مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے' لیکن یہ کبھی ممکن نہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت کوئی وسوسہ' کوئی وہم میرے دل سے تمہیں' تمہاری محبت کو کبھی نکال پائے گا"۔

آصف بولتا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے تپتے وجود پر آہستہ آہستہ ٹھنڈی شبنم گر رہی ہو۔ تراوٹ' تازگی اور ٹھنڈک کا لطیف احساس میری رگ رگ میں سرایت کر رہا تھا۔ میں بے خود ہوتی جا رہی تھی۔

"نجمہ! میں نہیں جانتا تمہارے اس فعل کا محرک کونسا جذبہ ہے؟ شاید عورت کا فطری انتقام تمہارے لاشعور میں پرورش پانے لگا ہے یا کچھ اور۔ بہر حال میں تمہیں کسی

ایسے فعل سے منع نہیں کروں گا جو بظاہر تمہارے یا میرے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ صرف ایک درخواست کروں گا کہ اگر یہ سب کچھ کسی منصوبے کا حصہ ہے تو اس سے دست بردار ہو جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ' صرف یہ یاد رکھو کہ تم آصف کے لئے بنی ہو اور تمہیں ڈاکٹر بن کر دنیا کو دکھانا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی پریشانیاں ہیں' جتنے دکھ ہیں وہ سب میری جھولی میں ڈال دو۔ جن سے محبت کی جائے ان کے سامنے نہ اپنے کسی عمل پر شرمندگی کا اظہار کیا جاتا ہے نہ ہی ان سے اپنے دکھ سکھ علیحدہ کئے جاتے ہیں"۔

اس نے میرے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں سہلاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے آصف نے کبھی مجھے اس طرح چھوا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں کی لمس' لہجے کی مٹھاس' ارادوں کی پختگی اور باتوں میں چھپے لامتزلزل جذبے نے مجھے دوسرے جہانوں میں پہنچا دیا۔

بے خودی کا طلسم تب ٹوٹا جب ہمیں کیبن کے قریب ویٹر کے قدموں کی شریفانہ چاپ سنائی دی۔ بل ادا کرنے کے بعد جب ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اتنا ہلکا پھلکا کہ مجھے اپنا وجود فضا میں اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

HBC
urdufans.com

گھر پہنچی تو وہی ہاؤ ہو جاری تھی۔

''زہراں! ایک در بند تو سو در کھلے۔ بے فکر رہ۔ ایک پرائیویٹ فرم میں چکر چلا رہا ہوں۔ اگر چل گیا تو یہ سمجھنا کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ سارے دھونے دھو ڈالوں گا''۔

والد کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی آج کل وہ کچھ زیادہ ہی شراب نوشی کرنے لگے تھے۔

آج پہلی مرتبہ انہیں گھر پر میں نے شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک برچھی سی میرے کلیجے میں اتر آئی۔ خود سے باندھے سارے پیمان ٹوٹتے دکھائی دیئے۔ کمرے میں والد صاحب کے دو تین دوست بھی اس خبیث میاں جی کے ساتھ موجود تھے۔

ڈرائینگ روم میں تو یہ ہنگامہ جاری تھا اور میرے کمرے میں امی اور ان کی ایک ''نوجوان سہیلی'' اپنے ''منگیتر'' سمیت براجمان تھے۔ میرا خون ہی تو کھول اٹھا۔ امی نے ہمارے گھر کو طوائف کا کوٹھا بنا ڈالا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی اس گھر میں ''غیرت'' کا وجود بہرحال باقی تھا۔

میری شکل میں..... ان کی اپنی اولاد کی شکل میں!!

''کیا بے ہودگی پھیلا رکھی ہے یہاں''۔ میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

ماں اور اس کے دوستوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ امی کے لئے یہ بالکل غیر متوقع اور اچانک بات تھی۔ انہیں تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

''کیا بک رہی ہو''۔

انہوں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''میں کہتی ہوں ایسی ذلیل حرکتوں کے لئے کیا میرا کمرہ ہی رہ گیا ہے۔ اور کیا مر گئے ہیں سب لوگ''۔

میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

''ٹھہر جا۔ حرام کی جنی۔ ابھی تیری خبر لیتی ہوں''۔

امی کے تیور خطرناک تھے۔

انہوں نے چاہا کہ اٹھ کر مجھے ماریں کہ ان کی نوجوان سہیلی اور دوست بیچ میں آ گئے۔

''جانے دیجئے آنٹی! کوئی بات نہیں۔ پھر کیا ہوا؟''

لڑکی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آنٹی..... فار گاڈ سیک۔ ہماری وجہ سے مت جھگڑا کیجئے''۔

اس کے ''منگیتر'' نے جو شکل سے مخنث زیادہ اور مرد کم نظر آ رہا تھا پھنسی پھنسی آواز نکالی۔

''تیری یہ مجال..... میں تجھے.....''

امی نے دونوں کے درمیان سے نکلتے ہوئے میری طرف بڑھنا چاہا لیکن عابدہ دوسرے کمرے سے بھاگتی ہوئی آئی اور امی سے اس طرح لپٹ گئی کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکیں۔

امی نے اسے جھٹکا دے کر خود الگ کیا تو وہ ماں کے قدموں میں گر پڑی۔

''امی خدا کے لئے''

اس نے اپنی فاحشہ ماں کے پیروں سے لپٹتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ایسی التجا تھی جو مرنے والوں کی آنکھوں میں آخری لمحے دکھائی دیا کرتی ہے۔

جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں ہی نہیں امی بھی پگھل کر رہ گئی اور ان کے دوست امی کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ مجھے علم تھا کہ شراب کے نشے میں دھت باپ کو کانوں کان اس حادثے کی خبر نہیں ہوئی ہوگی۔ اُن لوگوں کے وہاں سے دفع ہوتے ہی میں نڈھال سی ہو کر اپنے بستر پر جا گری۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے خود میں عجیب و غریب تبدیلی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی بہت مضبوط نجمہ آ کر چپکے سے بیٹھ گئی ہے جسے کسی کی پروا نہیں ہے۔ کسی کا خوف نہیں ہے ......!! نہ ہی مجھے اپنے عمل پر کوئی شرمندگی کا احساس ہوا۔ اپنے اندر موجود اس جرأت کا انکشاف مجھ پر پہلی مرتبہ ہوا۔

صرف پندرہ روزہ ٹریننگ کا ثمر تھا یہ؟ یا نفرت کے پکتے ہوئے لاوے نے اپنی راہ پالی تھی؟

دونوں ہی خیالات بیک وقت مجھے آئے۔

کچھ بھی تھا یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ مجھ میں کچھ تبدیلی تو رونما ہوئی ہے اور یہ بڑی کامیابی تھی میرے لئے؟

عابدہ فوراً واپس آ گئی تھی۔ بے چاری کمزور سی لڑکی۔ ''باجی'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے خود سے الگ کیا۔ اُسے سامنے کرسی پر بٹھا کر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''عابدہ رونے سے زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو''۔

HSC
urdufans.com

میرا لہجہ بھلے کتنا ہی نرم سہی لیکن اس میں چھپے طنز کو عابدہ نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ ''کم از کم میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی''۔

''میں کیا کروں باجی! ہم کیا کر سکتے ہیں''۔

وہ تڑپ کر بولی۔

''ہم سب کچھ کر سکتے ہیں عابدہ! صرف ذرا ہمت کی ضرورت ہے تم حوصلہ کرو۔ میرا ساتھ دو''۔

میں نے اپنی دانست میں اس کی ہمت بڑھائی۔

''باجی! میں آپ کی طرح بہادر نہیں ہوں''۔

اُس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میری طرح بہادر بننا ہوگا عابدہ! ورنہ کسی روز ''

میں نے ایک ایک لفظ چبا کر اور خاصے غصیلے لہجے میں عابدہ سے نامکمل بات کی جسے وہ فوراً سمجھ گئی۔

''خدا کے لئے باجی!''

اس نے میرے منہ کی بات چھین لی۔

''تم عقلمند ہو بہن! اپنا راستہ خود متعین کر لو۔ میں شروع ہی سے ماں باپ کے کہنے میں نہیں ہوں تم جانتی ہو۔ دنیا کا کوئی مذہب کوئی ضابطہ اخلاق انسانیت کی کوئی شق اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ماں باپ کے کہنے پر برائی کا راستہ اختیار کریں۔ نہ ہی کوئی ہم سے یہ بہانہ سننے پر تیار ہوگا کہ ہم مجبور تھے۔ یہ دنیا مجبوروں اور بے بسوں کے لئے نہیں۔ لوگ تو برائی کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔ ہم کیا نیکی کو زندہ رکھنے کے لئے قربانی نہیں دے سکتے''۔

Meanwhile, Wenger hit back at

میرے لیکچر نے اس کے آنسو سکھا دیے تھے۔ وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگی۔ شاید اس کے لئے میرا یہ روپ بالکل اجنبی اور چونکا دینے والا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ دودھ پیتی بچی نہیں رہی۔ ہماری ماں ہم سے وہ کام لے گی جو ہماری خالہ اپنی دو بیٹیوں سے لے رہی ہے...... اور میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ اٹھ کر باہر جا رہی تھی تو میں نے محسوس کیا جیسے نیکی ابھی اس کے اندر زندہ ہے۔ ابھی وہ اماں کے رنگ میں نہیں رنگی۔ سچ کہا ہے کسی نے نیکی کو موت نہیں۔ سچائی امر ہے۔ میری امی کی تمام تربیت پر ہماری دادی کی تربیت آج بھی غالب تھی۔

☆☆☆

کھانا عابدہ میرے لئے کمرے میں ہی لے آئی تھی۔ رات تک کسی نے میرے کمرے میں آنے کی ہمت نہ کی۔ رات گئے ابو میرے کمرے میں آئے۔ اس وقت وہ مکمل ہوش و حواس میں تھے۔ شاید اس لئے میں نے انہیں خوش آمدید کہا تھا ورنہ میرے تیور اس روز کچھ زیادہ ہی خطرناک تھے بالکل اس فوجی کمانڈر کی طرح جو آنکھیں بند کر کے دشمن کی صفوں کے اندر ہی اندر گھستا چلا جائے یہ سوچے جانے بغیر کہ اس کے اردگرد گھیرا بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کی پشت بھی غیر محفوظ ہے۔ میں اس وقت مطالعہ کر رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو میری پڑھاکو بیٹی؟''

ابو نے اندر آ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کالج کا کام کر رہی ہوں ابو!''

میں نے ان سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ میرے لہجے میں چھپی بغاوت کی خوشبو ان کے ہوشیار ذہن تک پہنچ گئی تھی۔

HBC
urdufans.com

''ارے کیا بیٹھنے کو بھی نہ کہو گی۔ بھئی ایسی ناراضگی بھی کیا۔''

انہوں نے خود ہی کرسی کھینچ کر میرے قریب کر لی۔

''نہیں ابو!''

میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ آخر وہ میرا باپ تھا۔

''دیکھو بیٹی! اگر ہم نے تمہاری طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور تم کالج میں پڑھ رہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم گستاخ بھی ہوتی جاؤ''۔

گرگ جہاندیدہ نے پہلا ہی وار بڑا کاریاں کیا تھا۔

''آپ کا شکریہ ابو! کہ آپ مجھے تعلیم دلوا رہے ہیں لیکن میں نے کبھی گستاخی کا تصور بھی نہیں کیا۔''

میں نے ڈھال سامنے کر دی۔

''شاباش! اپنی ماں کو جنم دینے والی ماں کو اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دے رہی ہو اور گستاخی کس چیز کا نام ہے؟''

خاوند نے بیوی کی بات دہرائی۔

''ابو! اس مسئلے کو نہ ہی چھیڑئے تو بہتر ہو گا۔''

میں نے پینترا بدلا۔

''یعنی تم سے یہ تک نہ پوچھوں کہ تم نے اپنی ماں کو ذلیل کیوں کیا تھا...... ؟ واہ بھئی واہ۔ کچھ زیادہ ہی تعلیم یافتہ ہو رہی ہو آج کل۔''

ان کے طنز کی کاٹ بظاہر تو گہری تھی۔ یہ الگ بات کہ چکنے گھڑے سے پھسلنے کے علاوہ اور کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ بات برائے بات کر رہے ہیں۔

''ابو! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے زبان کھولنے پر مجبور نہ کیجئے۔''

nation
Meanwhile, Wenger hit back at Nani, the Manchester United star who dismissed Arsenal's title hopes, claiming only United or Chelsea can be champions.
Wenger said "Everybody has a different opinion

میرے اندر پہلا ابال اٹھا۔

ابو نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میری بات کو وہ پا گئے اور فوراً سنبھالا بھی دے دیا۔

"دیکھو بیٹی! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ جانے کس گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اب اگر تم بھی مجھے دکھ دینے لگیں تو کسی روز میں منہ ہی کالا نہ کر جاؤں۔"

انہوں نے اولاد کی کمزور رگ کو بڑی چابکدستی سے دبایا۔

"ابو! خدا کے لئے ایسا مت سوچئے۔ امی نے "

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ابو نے ہاتھ بڑھا کر میری بات روک دی۔

"مجھے اور کچھ نہیں سننا۔ میں جانتا ہوں تم کچھ زیادہ ہی عقلمند ہو گئی ہو۔ اتنی عقلمند کہ تمہیں اپنی ماں بھی طوائف نظر آنے لگی ہے۔ دیکھو بیٹے جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہمارا کوئی بیٹا تو ہے نہیں کہ جو کچھ ہم کما رہے ہیں کہ وہ اس کے نام لگ جائے گا۔ یہ جو کچھ ہم کرتے ہیں صرف اور صرف تمہاری بھلائی کے لئے۔ تم تصور کرو کہ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کو آج کے زمانے میں کوئی منہ لگانے کے لئے بھی تیار ہے کیا؟ جب تک ہم نئے تقاضے نہیں اپنائیں گے کوئی تمہاری قابلیت اور سلیقہ شعاری پر لعنت بھی نہیں بھیجے گا۔ لوگ رشتہ کرنے سے پہلے اس کا وزن کرتے ہیں۔ اس کی اوقات کو حالات کے ترازو میں تولتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں بڑا کھلا Compotition کمپٹیشن ہے بیٹی! تم لاکھ پڑھ لکھ جاؤ کبھی اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تمہارے تایا کی بیٹیوں میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔ کیا کمی ہے ان کے کردار میں۔ گاؤں میں رہتے ہیں وہ لوگ۔ اس کے باوجود کسی نے آج تک رشتے کو نہیں پوچھا۔ جانتی ہو کیوں؟ نہ ان کی بیٹیوں کو نئے زمانے کے آداب آتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس دینے کو بے تحاشہ دولت رکھی ہے۔ بیٹی! تم لاکھ لائق فائق سہی لیکن ابھی اتنی

HBC
urdufans.com

عقلمند بھی نہیں ہو کہ ہمارے اعمال کا محاسبہ کرنے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری [illegible] نہیں ہوں۔ تم صرف ایک بات یاد رکھو کہ تم نے اپنی ماں کی بے عزتی کی ہے اس — مہمانوں کے سامنے۔ جاؤ اور فوراً اس سے معافی مانگو۔"

انہوں نے اپنا فیصلہ بھی بڑی ہوشیاری سے سنا دیا۔

یہ معاملہ صرف میرے باپ ہی کا نہیں دنیا بھر کے اس قماش کے سارے باپوں کا تھا۔ اگر یہاں نیاز محمد کی بجائے خیرات علی یا نذر حسین بھی ہوتا تو یہی کچھ کہتا۔ اتنی بودی اور گھسی پٹی دلیل کا لیپن تھوپن کر کے انہوں نے بظاہر اپنی بات کو بڑا مدلل اور وزنی بنا کر پیش کیا تھا لیکن اس گفتگو کے پس پردہ کیا ذہنیت کارفرما تھی اس کا اندازہ مجھے خوب تھا۔

"تمہارے ماں باپ کافر بھی ہوں تمہارے لئے ولیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔"

میرے لاشعور میں سوئی دادی اماں نے انگڑائی لی۔

اپنے اندر سلگتے جذبات کا گلا گھونٹ کر میں نے وقتی جان چھڑاؤ پالیسی یا پھر "دیکھو اور انتظار کرو" کا نظریہ اپنا کر امی اور والد کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔

میرا رخ امی کے بیڈروم کی طرف تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح جب میں کالج گئی تو مارشل آرٹس کی کلاس میں سب سے زیادہ میرا زور دیدنی تھا۔ خدا جانے مجھے یہاں جاتے ہی کیا ہو جاتا تھا یوں لگتا تھا جیسے مجھے چند روز بعد کسی زبردست مقابلے میں حصہ لینا ہے اور خوب تیاری کرنی ہے۔

"آپ بہت جلد کسی قابل ہو جائیں گی بی بی"

تبتی لاماؤں والی شکل کے انسٹرکٹر نے میرے [illegible]

HBC
urdufans.com

میرے اندر پہلا ابال اٹھا۔

ابو نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میری بات کو وہ پا گئے اور فوراً سنبھالا بھی دے دیا۔

"دیکھو بیٹی! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ نجانے کس گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اب اگر تم بھی مجھے دکھ دینے لگیں تو کسی روز میں منہ ہی کالا نہ کر جاؤں۔"

انہوں نے اولاد کی کمزور رگ کو بڑی چابکدستی سے دبایا۔

"ابو! خدا کے لئے ایسا مت سوچئے۔ امی نے "

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ابو نے ہاتھ بڑھا کر میری بات روک دی۔

"مجھے اور کچھ نہیں سننا۔ میں جانتا ہوں تم کچھ زیادہ ہی عقلمند ہو گئی ہو۔ اتنی عقلمند کہ تمہیں اپنی ماں بھی طوائف نظر آنے لگی ہے۔ دیکھو بیٹے جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہمارا کوئی بیٹا تو ہے نہیں کہ جو کچھ ہم کما رہے ہیں کہ وہ اس کے نام لگ جائے گا۔ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں صرف اور صرف تمہاری بھلائی کے لئے۔ تم تصور کرو کہ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کو آج کے زمانے میں کوئی منہ لگانے کے لئے بھی تیار ہے کیا؟ جب تک ہم نئے تقاضے نہیں اپنائیں گے کوئی تمہاری قابلیت اور سلیقہ شعاری پر لعنت بھی نہیں بھیجے گا۔ لوگ رشتہ کرنے سے پہلے اس کا وزن کرتے ہیں۔ اس کی اوقات کو حالات کے ترازو میں تولتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں بڑا کھلا Competition کمپیٹیشن ہے بیٹی! تم لاکھ پڑھ لکھ جاؤ کبھی اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تمہارے تایا کی بیٹیوں میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔ کیا کمی ہے ان کے کردار میں۔ گاؤں میں رہتے ہیں وہ لوگ۔ اس کے باوجود کسی نے آج تک رشتے کو نہیں پوچھا۔ جانتی ہو کیوں؟ نہ ان کی بیٹیوں کو نئے زمانے کے آداب آتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس دینے کو بے تحاشہ دولت رکھی ہے۔ بیٹی! تم لاکھ لائق فائق سہی لیکن ابھی اتنی عقلمند بھی نہیں ہو کہ ہمارے اعمال کا محاسبہ کرنے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری کوئی دلیل سننے کو تیار نہیں ہوں۔ تم صرف ایک بات یاد رکھو کہ تم نے اپنی ماں کی بے عزتی کی ہے مہمانوں کے سامنے۔ جاؤ اور فوراً اس سے معافی مانگو۔"

انہوں نے اپنا فیصلہ بھی بڑی ہوشیاری سے سنا دیا۔

یہ معاملہ صرف میرے باپ ہی کا نہیں دنیا بھر کے اس قماش کے سارے باپوں کا تھا۔ اگر یہاں نیاز محمد کی بجائے خیرات علی یا نذر حسین بھی ہوتا تو یہی کچھ کہتا۔ اتنی بودی اور گھسی پٹی دلیل کا لیپن تھوپن کر کے انہوں نے بظاہر اپنی بات کو بڑا مدلل اور وزنی بنا کر پیش کیا تھا، لیکن اس گفتگو کے پس پردہ کیا ذہنیت کارفرما تھی اس کا اندازہ مجھے خوب تھا۔

"تمہارے ماں باپ کافر بھی ہوں تمہارے لئے ولیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔"

میرے لاشعور میں سوئی دادی اماں نے انگڑائی لی۔

اپنے اندر سلگتے جذبات کا گلا گھونٹ کر میں مختصر وقتی جان چھڑاؤ پالیسی یا پھر "دیکھو اور انتظار کرو" کا نظریہ اپنا کر امی اور والد کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔

میرا رخ امی کے بیڈروم کی طرف تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح جب میں کالج گئی تو مارشل آرٹس کی کلاس میں سب سے زیادہ میرا زور دیدنی تھا۔ خدا جانے مجھے یہاں جاتے ہی کیا ہو جاتا تھا یوں لگتا تھا جیسے مجھے چند روز بعد کسی زبردست مقابلے میں حصہ لینا ہے اور خوب تیاری کرنی ہے۔

"آپ بہت جلد کسی قابل ہو جائیں گی بی بی۔"

تبتی لاماؤں والی شکل کے انسٹرکٹر نے میرے پسینے میں بھیگے جسم کا جائزہ لے کر

HEC
urdufans.com

اپنی رپورٹ پیش کی۔

''لوگ پہلے پہل بڑے ذوق شوق سے اس طرف آتے ہیں پھر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ مشقت سے ڈرتے ہیں بے چارے۔ مس نجمہ! بندے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ محنت سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے سب کچھ بیٹھے بٹھائے ہی مل جائے۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ یہاں کچھ پانے کے لئے بھی جی جان سے محنت کرنا پڑتی ہے اور دیکھیے نا مس! مزا بھی اسی شکار کا آتا ہے جو بڑی جدوجہد کے بعد ہاتھ لگے۔ شکاری جنگل کی کانٹے دار جھاڑیوں میں دوڑتا پھرے، دلدلوں میں پھنسائے، پانیوں اور کیچڑ میں گھسیٹتا پھرے''۔

کبھی کبھی وہ انسٹرکٹر کی بجائے دانشور دکھائی دیتا تھا۔

''سر! میرا یہ سٹیپ ٹھیک اٹھتا ہے نا''۔

میں اس کے ممکنہ طویل لیکچر سے نجات پانے کے لئے ہمیشہ اسی سے ملتا جلتا کوئی نقرہ کہہ کر اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کروا دیتی۔

☆☆☆

آصف کی مصروفیات اب کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ انجینئرنگ میں داخلہ لے لینا ہی بہادری نہیں تھی۔ اب اس منہ میں آئی کوڑھ کرلی کو نگلنا بھی ایک کام تھا۔ وہ دن رات پڑھتا، محنت کرتا، اپنے شاندار مستقبل کے لئے! لیکن اس نے ملاقات کا مقدس فریضہ کبھی نہ بھلایا۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ وہ ضرور مجھ سے ملتا۔ مجھے نصیحتیں کرتا۔ محبت کی باتیں کرتا۔ زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنے کو کہتا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جو کچھ مجھے آصف کہہ رہا ہے، وہ اصل میں میرے باپ کو مجھ سے کہنا چاہئے تھا۔

اور کبھی کبھی یہ احساس گزرتا کہ وہ جس قرینے جس سلیقے سے زندگی بسر کرنے کا

سبق دے رہا ہے اصل میں یہ میری ماں کا فرض تھا کہ مجھ سے ایسی باتیں کرتی۔ اس کی محبت پوری کائنات پر محیط تھی۔ وہ سائبان تھا جس کے تلے میں زندگی کی کڑکتی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے آن بیٹھتی تھی۔ اس نے ہمدردی سے دیکھ سے محبت سے مجھے کبھی سیدھے راستے سے نہ ہٹنے دیا۔

زندگی کے جس منہ زور کف اڑاتے گھوڑے پر میں سوار تھی۔ اس کی باگیں عملاً میں نے آصف کو تھما دی تھیں۔ آصف بڑا منجھا ہوا سائیس تھا۔ وہ دوڑ کی اور عام چال کا فرق بخوبی جانتا تھا۔ اس نے کبھی اس منہ زور گھوڑے کو غلط قدم نہ اٹھانے دیا۔ ہوٹلوں میں، باغات کے کسی محفوظ کنج میں، دریا کی لہروں پر ہلکورے لیتی کشتی میں کبھی بھی کسی بھی جگہ اس نے اپنا فرض نہ بھلایا۔ کبھی اس نے کوئی چوک نہ کی۔

اپنے پائنچے اونچے کئے ننگے پاؤں ساحل پر بھی دریا کی ریت نما مٹی میں ہم دونوں اپنے قدموں کے نشان چھوڑتے ہوئے بھاگتے چلے جاتے۔ ہمارے سانس پھولنے لگتے۔ سینوں کا زیر و بم ایک دوسرے پر بجلیاں گرانے کو لپکتا لیکن اس نے کبھی اپنے وجدان کی باگیں دل کو نہ تھمائیں۔ اس کی آنکھوں میں کبھی شہوت کی سرخیاں نہ لہرائیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اس کے ٹھنڈے رویئے سے الجھن ہونے لگتی۔

میرا جی چاہتا آصف مجھے دوڑ کر بازوؤں میں بھر لے اور ہم ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں دھڑکنے لگیں۔ اس کے قرب سے میری سانسیں ٹوٹنے لگتیں۔ لیکن وہ شانت رہتا سمندر کی طرح جس کے اندر طوفان ٹکراتے ہوں لیکن جو باہر سے مکمل پرسکون رہے۔ اس ندی کی طرح جو صدیوں سے اپنے سینے میں جانی انجانی کہانیاں چھپائے اپنے نئے اور پرانے پانیوں کے ساتھ چپ چاپ بہتی چلی جائے۔ جب کبھی میرے اندر کوئی بے نام سی خواہش انگڑائیاں لے کر مجھے توڑنے لگتی، وہ مہاتما بدھ بن کر میرے سامنے

HBC
urdufans.com

گزارا ہو جاتا۔

میں گھر کی تلخیوں سے فرار چاہتی تو اس کی محبت کے برگد کی ٹھنڈی چھاؤں میں اپنا چہرہ چھپا لیتی۔ زیادہ محنت کرنے سے ایک نازک سی عینک اس کی ناک پر جم گئی تھی۔ جب کبھی وہ مجھے پریشان پاتا تو بدھ بھکشوؤں کی طرح عینک کے شیشوں کو رومال سے صاف کر کے ناک پر جماتا پھر اپنے ذہن کی پوتھی سے کوئی ایسا قاعدہ، ایسا کلیہ، ایسا فلسفہ، ایسی منطق باہر نکالتا کہ میں ششدر رہ جاتی۔

محبت کے وہ سارے لوازمات ہم نے پورے کئے جن کی تکمیل دنیا بھر کے عاشقوں کے لئے لازم ہے۔

ہم نے پتھروں پر دل تراشے، درختوں کی چھاتیوں میں اپنے نام کے تیر گاڑے دریا کے ریتلے ساحل پر Love لکھ لکھ کر مٹایا اور مٹا مٹا کر لکھا۔ یوکلپٹس کے تاریک جھنڈ میں گیلی مٹی اور گرتے پتوں کے ملاپ سے اٹھنے والی خوشبوؤں کو اپنے اندر سمویا۔ پائن کے درخت تلے گرمیوں کی دوپہروں میں گھاس پر آلتی پالتی مار کر کوک کی بوتلیں پئیں۔ سرخ اور پیلے گلابوں کی خوشبوئیں محسوس کیں۔ آموں کے بور پر کوئلوں کی کوکو سنی۔ مولسری کی کلیاں بکھر کر زمین پر سفید رنگ کی چادر بچھتے دیکھی۔ گیندے کی باس، نارنگی کے شگوفے سب سے حظ اٹھایا۔ اپنی پسند کے ریکارڈ ایک دوسرے کو سنائے۔

لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ وقت ارجن کے بھگوان کی طرح اپنی تخلیق کو خود ہی نشٹ کر دیا کرتا ہے اور زندگی صرف مستقبل کا نام نہیں۔ ایک سپتک کا قانون موسیقی کی دنیا میں کہیں رائج نہیں۔ وقت کا گیت مدھ، مندر اور تار تینوں سپتکوں میں گانا پڑتا ہے۔ یہاں پہلے اور دوسرے "کالے" سے نہیں پہلا "پنچم" سے نہیں ہر سر سے ہر تال سے راگ پھوٹتے ہیں۔ یہ تیور اور ریاضت کی دنیا ہے۔ اس کی وادی اور سم وادی کو جانے بغیر اس میں

قدم رکھنا سانپ کی بانبی میں منہ دینے کے مترادف ہے۔ ہم نے اپنے دل کے نہاں خانے پر محبت کی وینس کو اس وقت اوریاں دلائیں جب ہمارے آئس کریم کھانے اور ٹیبل ٹینس کھیلنے کے دن تھے۔

محبت کے اس ریگ زار میں بھاگتے ہوئے شاید میں نے زندگی کا دوسرا چہرہ بھلا ہی دیا تھا۔ میں نے بھلا دیا کہ محبت کے کھنڈی کھنڈے میں ہمیشہ چھکا ہی نہیں اکا کرتا کبھی چاروں "کانے" بھی گرتے ہیں۔

تانبے کے کشتے کو کھرل کرنے کے لئے بڑا لمبا منیاس بھگتنا ہوتا ہے۔ بڑے جنگلوں کی خاک چھانی ہوتی ہے۔ لوہا یونہی میگنٹ نہیں بن جاتا۔ بڑے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اس کو۔ خراد کی سان پر چڑھنے کے بعد ہی دھات کوئی شکل اختیار کرتی ہے اور وہ بڑے جاں گسل لمحات ہوتے ہیں۔

محبت گیند کا کھیل نہیں، لوڈو کی بازی نہیں کہ مقابل کو دھوکہ دے کر گوٹیاں آگے پیچھے کر لی جائیں۔ یہ شطرنج کی ایسی بازی ہے جسے جیتنے والا ہارتا اور ہارنے والا جیت جاتا ہے۔ اس کھیل کے دستور ہی نرالے ہیں۔

جب میں نے اپنے "حال" کی طرف دیکھتی تو اس بات پر جھوم کر رہ جاتی کہ وقت نے سارے رنگ کے پتے میری جھولی میں ڈال دئے ہیں لیکن اس بات کا گمان بھی نہ گزرا کہ ترپ چال تقدیر ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ آدمی بظاہر بڑے ٹھسے سے "تینوں بادشاہوں" کے بل بوتے پر "شو" کرتا ہے لیکن اچانک غلام کا اکا اسے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

حالات کا بننا، بگڑنا، بنانا، بگاڑنا کچھ بھی تو انسان کے بس میں نہیں۔ صرف سوچیں اپنی ہیں، خیالات اپنے ہیں۔ بس سوچتے جاؤ، مستقبل کے سنہرے سپنے بنتے جاؤ اور

ایک روز سب کچھ خاموشی سے اپنی موت مر جاتا ہے۔ نتائج اتنے مختلف اور خلاف توقع ہوتے ہیں کہ سوچیں منجمد ہو جاتی ہیں اور ارادوں کو موت آ جاتی ہے۔

☆☆☆

HBC
urdufans.com

اس روز جب کمپنی باغ کے ایک خوبصورت گوشے میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے آصف نے ابو کے تبادلے اور اپنے وظیفہ پا کر غیر ملک جانے کا اعلان کیا تو جیسے سب الوژن ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ ہمارے دونوں اطراف میں اپنی مترنم' متوازن اور پرسکون آواز میں گنگناتے جھرنوں کو موت آ گئی۔ چشمے کے کنارے لگے سنگ مرمر کے خوبصورت مجسمے نیچے گرے اور ٹوٹ گئے۔ فضاؤں کے سارے حسن کو زہریلے پھنکارتے ناگ نے ڈس لیا۔ میرے گرداگرد اگی خوبصورت پھولوں کی بیلوں نے اژدھوں کا روپ دھار کر مجھ پر آگ برسانی شروع کر دی۔

ازل سے آج تک خدائے بزرگ و برتر کی ہزاروں سلطنتیں' ثقافتیں' تہذیبیں بنتی اور بگڑتی آئی ہیں لیکن اس روز مجھے یوں لگا جیسے قیامت کی ساری نشانیاں ظاہر ہو گئی ہیں۔ پہاڑ روئی کے دھنکے ہوئے گالے بن کر اڑنے لگے ہیں' سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے۔ میرے گرداگرد اوپر نیچے موجود ساری کائنات جھلسنے لگی۔

دسمبر کے سورج کی کرنوں نے شبنم کو چوس کر گھاس میں چنگاریاں دوڑا دیں۔ چائے کا گھونٹ تیزاب بن کر میرے حلق سے گزرتا جسم کی تمام وریدوں اور رگوں میں گردش کرنے لگا۔ میرے بدن میں انگاروں کا رقص شروع ہو گیا۔ میری حالت اس مریض کی سی ہو گئی جو کلوروفارم سونگھنے کے فوراً بعد آپریشن ٹیبل سے اٹھ کر بھاگ گیا ہو۔ میری

کنپٹیاں شائیں شائیں کرنے لگیں۔ سب کچھ گڈمڈ ہونے لگا۔

بظاہر میں سب کچھ دیکھ رہی تھی' محسوس کر رہی تھی' بول رہی تھی' لیکن حقیقتاً میری تمام حسیات کو موت آ چکی تھی۔ کلیجہ خون ہو رہا تھا۔ زبان کا ذائقہ بدل چکا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے آصف کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی ہو رہی تھی۔ آج تک اس کی آنکھیں میں نے اس طرح نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ رخصت ہو چکی تھی۔

اس کی عینک کے شیشے دھندلا گئے۔ ہمیشہ کی طرح اس نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا۔ اس سے اپنی عینک کے شیشے اور گیلی آنکھیں پونچھیں اور رومال میری طرف بڑھا دیا۔

"آنسوؤں کا ذائقہ تو کچھ خاص نہ ہو گا' لیکن آنسو مرتے نہیں۔ یہ منجمد ہو کر انسان کے اندر ہمیشہ جمے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک رومال سے تمہارے آنسو پونچھے تھے۔ تم یہ رومال رکھ لو جس طرح وہ رومال میں نے رکھ لیا ہے۔ محبت بڑی عجیب شے ہے۔ یہ اچھے بھلے سنجیدہ اور سمجھدار بندے کو بسا اوقات بچہ بنا دیتی ہے۔ نجمہ! میں آج خود کو تمہارے سامنے بچہ محسوس کر رہا ہوں۔ آج تک میں تمہاری انگلی تھام کر تمہیں چلاتا آیا ہوں۔ آج تم تھوڑی دیر کے لئے آصف بن جاؤ۔"

اس نے کسی گہرے کنوئیں میں بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا۔

میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار مار روؤں۔ اتنی سینہ کوبی کروں کہ کلیجہ شق ہو جائے۔ اپنے آنسوؤں میں ساری کائنات کو بہا دوں' لیکن کسی نے میرے اندر بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا۔

"یہ خود غرضی ہے نجمہ! تیرا محبوب بڑا آدمی بننے باہر جا رہا ہے۔ قسمت نے اسے

HBC
urdufans.com

زندگی میں آگے بڑھنے کا موقعہ دیا ہے۔ اس کی محنتوں کے درخت پر بڑی لمبی تپسیا کے بعد ثمر لگا ہے۔ اب کیا تم بزدلوں کی طرح اس کے سامنے رو کر اس کے ارادوں کو متزلزل کرنا چاہتی ہو۔ تم کیا یہ چاہتی ہو کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر نہ جائے یا اگر بادل نخواستہ جائے بھی تو ایک پھانس اس کے سینے میں اٹکی رہے۔ اس کا دھیان تعلیم سے ہٹ کر تمہاری طرف لگا رہے۔ نہیں...... نہیں...... یہ خود غرضی ہو گی۔ یہ بہت بڑا ظلم ہو گا اس کے ساتھ...... پگلی سنبھل جا...... آنسوؤں کا گلا گھونٹ دے۔ سینے سے اٹھتی ہوک کو سینے ہی میں دفن کر لے۔ قربانی دے...... قربانی دے...... ذبح ہو جا...... اپنے ارمانوں کو اپنی تمناؤں کو محبت کی بھینٹ چڑھا دے...... مسکرا...... مسکرا کر دیکھ اس کی طرف...... اس کا حوصلہ بڑھا......!"

اور میں مسکرا دی......!

آنسوؤں سے بھیگی اس مسکراہٹ نے آصف کو بھی رلا دیا۔ اس نے آج پہلی مرتبہ بے اختیار مجھے آگے بڑھ کر سینے سے چمٹا لیا۔

"نجمہ! میں تمہیں اپنی دھڑکنوں میں اپنی سانسوں میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ دو سال ہی کی تو بات ہے۔ تم میڈیکل میں پڑھ رہی ہو گی اور میں انجینئر بن کر لوٹوں گا...... کیسا شاندار لگے گا وہ سب کچھ...... یہ تصور ہی کتنا خوشگوار ہے نجمہ۔"

اس نے میرے کانپتے وجود کو بڑی آہستگی سے تھپتھپا کر خود سے الگ کیا اور ہم ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئے!

میرے ایف ایس سی کے امتحانات میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ ساری رات میں اپنا تکیہ آنسوؤں سے بھگوتی رہی۔ فرزانہ بھی تو یہاں سے جا رہی تھی۔ کوئی بھی تو ڈھکوسلا باقی نہیں بچا تھا میرے لئے۔ کیسی کرموں جلی تھی میں۔ کیسے بھاگ تھے میرے۔

CHRISTMAS DAY
CRICKET

یوں بھی کوئی لٹتا ہے جیسی میں بیچ راستے کے لٹی تھی۔

صبح میں کالج گئی تو کلاس روم کے باہر ہی تبتی لاماؤں کی شکل والا انسٹرکٹر لڑکیوں کے گھیرے میں کھڑا تھا۔

''مس نجمہ!'' اس نے دیکھتے ہی خوشی کے ملے جلے تاثرات سے پکارا۔ ''کل آپ بلیک بیلٹ کے لئے فائٹ لڑ رہی ہیں''۔

''سر!'' میں نے ٹوٹتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''میں معافی چاہتی ہوں۔ اب میں کورس اٹینڈ نہ کر سکوں گی''۔

''پاگل ہو گئی ہے ڈیئر''۔ فرخندہ نے مجھے قریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''تم واحد لڑکی ہو اس کالج سے بلیک بیلٹ کے لئے فائٹ لڑ رہی ہو''۔

میں نے آہستگی سے اپنی سہیلی کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف کیا اور اپنے کلاس روم میں داخل ہو گئی جہاں اردو کی مسز خان بڑی سوز مندی سے غالب کا یہ شعر سنا رہی تھیں۔

دیتا نہ اگر دل تمہیں لیتا کوئی دن چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

کالج میں دو تین پیریڈ بعد ہی میں اٹھ کر گھر چلی آئی۔ پانچویں روز آصف کی روانگی تھی۔ اگلے روز وہ مجھے ملنے آیا۔ ہم شام گئے تک ایک دوسرے کو طفل تسلیاں دیتے رہے۔ پھر وہ رخصت ہو گیا۔

''مجھے ضروری کاغذات کی تیاری کے لئے اسلام آباد جانا ہے۔ وہیں سے میری فلائٹ بھی ہے۔ ہمیں اب رخصت ہونا ہے نجمہ!''

اس کی آواز بڑی گمبھیر تھی۔

میں نے اپنی زخمی نظریں اٹھائیں۔ اس کے سراپے کو جی بھر کے دیکھا۔ جانے

urdufans.com

اب کے بچھڑے پھر کب ملیں۔ یہ غنیمت لمحے بڑے جانگسل تھے۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں اس کے سینے سے جا لگی۔ اس روز زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ آصف نے اپنے تپتے ہونٹ میری پلکوں پر رکھ دیئے۔

''میں یہ روشنیاں اپنے ساتھ لے جاؤں گا نجمہ......!'' وہ آج دوسری طرح کا مرد نظر آ رہا تھا۔

دم رخصتیں وہ مجھے رکشہ میں گھر تک چھوڑنے آیا۔ پھر ہاتھ ہلاتا رخصت ہو گیا۔

میں شکستہ دل، نڈھال وجود لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی جہاں فرزانہ اور اس کی دوسری بہن میرا انتظار کر رہی تھیں۔

پرانے محلے سے رخصتی کے وقت اس نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر آخری وقت تک عمل پیرا رہی۔

''باجی! آپ کو علم تو ہو گیا ہو گا......''

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے یہی جانا تھا کہ میرے آنسو اب خشک ہو چکے ہیں، لیکن وہ سوتے پھر پھوٹ نکلے۔ میں اس سے لپٹی آنسو بہاتی رہی۔

''آپ بہت یاد آئیں گی باجی! میں آپ کو روزانہ خط لکھا کروں گی...... اللہ وہ دن جلد لائے باجی! جب آپ دلہن بن کر ہمارے ہاں آ جائیں''۔

اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

مجھے حوصلہ مند رہنے کی تلقین کر کے دونوں بہنیں بھی رخصت ہو گئیں۔

یہ بڑا جان لیوا صدمہ تھا۔ پہلے پہل تو خود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس جانکاہ حادثے سے سنبھل پاؤں گی۔ لیکن آہستہ آہستہ حواس بحال ہونے لگے۔ فرزانہ نے جاتے

HBC
urdupls.com

[illegible]ی خط لکھا تھا۔ پھر آصف کا وہ خط آ گیا جو اس نے اسلام آباد سے رخصت کے وقت لکھا تھا۔ اس کے بعد وہ جس جس ائیر پورٹ پر رکا مجھے خط لکھتا گیا۔ اس نے ہر خط میں اپنی محبت کی شدت کا یقین دلایا تھا۔ مجھے نارمل رہنے کی استدعا کی تھی اور کہا تھا کہ یہ سب کچھ بھول کر ساری توجہ امتحانات پر دوں کیونکہ ایف ایس سی کے رزلٹ ہی پر سارے کیریر کا دارومدار تھا۔

☆☆☆

والدہ نے اپنے لچھن تو نہ بدلے۔ میں نے البتہ ''درگزر'' کی پالیسی اپنالی اور اپنی آنکھیں ایک طرح سے بالکل ہی بند کر لیں لیکن اس واقعہ کے بعد کسی کو میرے کمرے میں گھس کر کوئی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ امی نے تو ایک طرح سے میرا مقاطعہ کر رکھا تھا۔ مہینوں ہم ماں بیٹی میں بمشکل چند باتیں ہی ہو پاتی تھیں۔ عابدہ نے پہلے پہل تو میری بات مانی لیکن جس بری طرح سے وہ والدہ کے رنگ میں رنگی جا چکی تھی وہاں سے اس کی واپسی خاصی مشکل نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کا وہی پرانا معمول بن گیا۔

میاں جی نے اپنے اثر و رسوخ سے والد صاحب کو اس مقدمے سے بری کروا لیا تھا لیکن ان کے محکمے نے دوبارہ انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر والد نے ایک الگ مقدمہ اپنے محکمے کے نام دائر کر رکھا تھا۔

اس دوران ایک پرائیویٹ فرم ان کے ہتھے چڑھ گئی جہاں پر چند روز بعد ہی ان [illegible]ے جوہر کھلنے لگے۔ انہوں نے اپنے کہنے کے مطابق واقعی ''دھونے دھو ڈالے تھے''۔ [illegible]ست بہاریں لوٹ آئیں۔ امی کو دن رات جوان رہنے کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میاں جی [illegible] لگی تھی۔ اس نے اپنی معتقد عورتوں کا ایک حلقہ یہاں میری ماں کی مدد [illegible] تھا۔ یہ سب ذہنی [illegible] تھیں جو اپنی نسوانیت کا خون کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

ان کی شہرت اب یہاں بھی ہونے لگی تھی اور محلے کے آوارہ منش نوجوانوں کی بھوکی نظریں اب میرا طواف بھی کرنے لگی تھیں۔ اسی برے وقت کے لئے میں نے مارشل آرٹس میں کچھ ''شدبد'' پیدا کی تھی۔ دو ماہ میں پانچ شریف زادے مجھ سے اچھی بھلی ٹھکائی کروا چکے تھے جس کے بعد سے جہاں محلے کے لفنگے مجھ سے خوفزدہ رہنے لگے تھے وہاں امی اور ابو کے ''دوستوں'' کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ ''نجمہ جوڈو کراٹے بھی جانتی ہے''۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کسی نے میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کی۔ میں بھی خود کو گھر سے الگ تھلگ کسی دوسری دنیا کی مخلوق جاننے لگی تھی۔

ایف ایس سی کے امتحانات شروع ہو گئے۔ ابھی میرے آدھے پرچے ہی ہوئے تھے کہ ایک روز رات کے وقت تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا دیا۔

''پولیس ابو کو گرفتار کرنے آئی ہے''۔

عابدہ نے میرے کان میں سہمی سہمی سرگوشی کی۔

''ہیں'' میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔

ہم دونوں بہنیں ہی خوف سے لرزتی سہمی ہوئی برآمدے تک آئیں۔ ابو کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔ امی نے حسب روایت یہاں بھی اپنے غمزہ و ادا سے تھانیدار کو بہلانا چاہا لیکن منہ کی کھائی۔

''عقل کر مائی! کیا تیرا بھی ساتھ ہی جانے کا پروگرام ہے''۔

نوجوان اے ایس آئی نے جس کا فراخ اور چمکدار ماتھا اس کے ''اصلی'' اور ''حلالی'' ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا امی کو ڈانٹ پلائی۔

''میں نمٹ لوں گی تم سب سے''۔

امی اپنی اوقات پر اتر آئیں۔

FBC ans.com

اس کی اس بات کا جواب ایک خجستہ صورت حوالدار نے پولیس کی مخصوص اور سچا زبان میں ایسا دیا کہ پھر امی کو بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

''گھر کا خیال رکھنا میں ذرا میاں کے پاس جا رہی ہوں''۔

انہوں نے ہمیں متنبہ کیا اور اس کے فوراً ہی بعد گھر سے نکل گئیں۔

پولیس کی زبانی علم ہوا کہ جس کمپنی میں والد صاحب کام کرتے تھے وہاں کا ایک آدمی کسی دوسرے شہر میں چوری کا مال بیچتے ہوئے گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ شخص ابو کا کارندہ تھا۔ اس نے پولیس کا ایک جوتا کھائے بغیر سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور اب ابو کو چوری اور غبن کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ الزامات کی نوعیت خاصی سخت تھی اور بچ نکلنے کے امکانات بھی کم ہی نظر آ رہے تھے۔

ساری رات گھر میں ہم دونوں بہنیں اور ایک بوڑھا ملازم ڈرے سہمے اپنے اپنے کمروں میں دبکے رہے۔ مجھے افسوس تو بے حد ہوا لیکن دکھ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کب تک بکرے کی ماں خیر مناتی۔ ابو اور امی کا تو یہ ایمان بن چکا تھا کہ پیسے کے زور سے سب کو گرایا اور جھکایا جا سکتا ہے لیکن آج انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ معاملہ اس کے الٹ بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتا ہے۔

اس کے باوجود بھی امی اس خبیث میاں کے پاس اپنے جوہر آزمانے چلی گئی تھیں۔

علی الصبح جب مؤذن نے خدا کی حمد و ثنا کے ساتھ سب کو نماز پڑھنے کی تلقین کی تو میں بے اختیار خدا کے حضور جھک گئی۔ میں نے گڑگڑاتے ہوئے التجا کی کہ مولا میرے [illegible]ن کی اس دلدل سے باہر نکال لے۔ انہیں انسان اشرف المخلوقات بنا دے۔

شاید دعاؤں کے مستجاب ہونے کا بھی کوئی مخصوص وقت ہوتا ہوگا اور نجانے کبھی ان خاص لمحات کا ادراک نصیب نہ ہوا۔ امی کی واپسی میاں جی کے ساتھ ہوئی۔ دونوں سیدھے ڈرائنگ روم میں جا گھسے۔

''ہمارے لئے چائے بنا لاؤ''۔

انہوں نے مجھے حکم دیا جو میں نے حسب عادت عابدہ کو منتقل کر دیا۔

''زہراں! دیکھ لیا ہم سے الگ رہ کر کام کرنے کا نتیجہ۔ اب بھگتنے دو اسے اکیلا''۔

میاں کی آواز بلند ہوئی۔

میں کمرے کی کھڑکی سے کان لگائے کھڑی تھی۔

''میاں جی! اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ معاف کر دیں''۔

ماں کی آواز سنائی دی۔

''زہراں! تیری خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ میاں یاری لگاتا ہی نہیں نبھانا بھی جانتا ہے۔ ویسے میری مان تو اسے رہنے دے دو چار ماہ جیل میں۔ خوامخواہ کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے۔ تجھے ہمارے ہوتے ہوئے کمی آخر کس بات کی ہے''۔

اس کی مکروہ آواز میری سماعت پر آری چلانے لگی۔

''میاں جی! سمجھا کرو۔ دنیا داری بھی آخر کسی چیز کا نام ہے''۔

ماں کی آواز نے میرے کانوں میں زہر گھولا۔

مجھ میں مزید خباثت انگیز گفتگو سننے کی تاب باقی نہیں رہی تھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور اپنے بستر پر گر کر اپنی بدبختی کا ماتم کرنے لگی۔

☆☆☆

آصف کی جدائی' والد کی گرفتاری' ماں کی بے راہروی' ان سب باتوں نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ کتاب کھولتی تو لفظ گڈمڈ ہو کر رہ جاتے۔ ان کی شکلیں بگڑنے لگتیں اور عجیب عجیب مکروہ چہرے اس میں سے جھانکنے لگتے۔ وسوسوں کے پھنکارتے ناگ اپنے پھن کاڑھے میرے گرداگرد بیٹھ رہے۔ میں ہر روز ایک نئے کرب سے آشنائی حاصل کرنے لگی۔ ان حالات میں حوصلے اور امید کا پیغام فرزانہ اور آصف کے وہ دو چار خطوط تھے جو بعد میں میرا سرمایہ حیات بنے......! لیکن لفظوں کے سہارے امیدوں کے آسرے پر زندگی نہیں گزرتی لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ہاتھ کی باندھی گانٹھیں دانتوں سے کھولنی پڑتی ہیں کہ یہ قانون فطرت ہے۔

المیہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ گانٹھیں کوئی اور لگاتا ہے لیکن انہیں کھولنے کا کشٹ کسی اور کا مقدر بن جاتا ہے۔

جیسے تیسے کر کے میرے امتحانات بھی ختم ہو گئے تو وقت گزاری کا اور کوئی شغل باقی نہ رہا۔ اب میری تمام تر امیدیں اپنے رزلٹ سے وابستہ تھیں۔ ان سارے گورکھ دھندوں کے باوجود میرے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے اور مجھے اپنی محنت اور خدا کی ذات سے کلی امید تھی کہ میرے نمبر بہت شاندار آئیں گے۔

اس دوران بظاہر میں گھر کے معاملات سے لاتعلق بنی رہی تھی لیکن مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ ابو لمبی جیل یاترا پر چلے گئے تھے۔ امی کے لچھن وہی تھے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اب ان کی سوشل سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ اس خبیث میاں کے کرتوت دیکھ کر میرا خون کھولتا تھا لیکن میں بہت کچھ چاہتے ہوئے کچھ نہ کر سکتی تھی۔ میری حالت ان مظلوم طوائف زادیوں جیسی تھی جن کے لئے فرار کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہ بہت کچھ کر گزرنے کی ہمت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کر پاتیں۔

☆☆☆

urdufans.com

رزلٹ نکلنے سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے شاید امی اور عابدہ والدہ سے جیل ملاقات کرنے گئے تھے۔ میں گھر میں اکیلی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میاں ایک رکشہ اتر کر اندر آ رہا تھا۔

''گھر میں کوئی نہیں''۔

میں نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اسے بے رخی سے جواب دے کر واپس جانے کو کہا لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے احتیاطاً داخلے کا دروازہ بند کر دیا۔

میں تو خود اس موقع کی منتظر تھی کہ کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔ اور اس موذی کو کوئی سبق سکھاؤں۔

''سنا نہیں''۔ میں نے کہا۔ ''گھر کوئی نہیں۔'' میں نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

''ہم کوئی باہر کے تو نہیں ہیں۔ گھر والے ہیں۔''

اُس نے شاید نشہ کر رکھا تھا۔

وہ اب میرے بالکل نزدیک آ چکا تھا اور اس کے منہ سے اٹھتے شراب کے بھبکے مجھ تک پہنچنے لگے تھے۔ گویا یہاں پورا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ گھر پر میں اکیلی ہوں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہوس جس طرح لپٹیں مارنے لگی تھی اس کا اندازہ تو مجھے تھا لیکن اس کی اتنی ہمت۔ یہ میں نے کبھی نہ سوچا۔ ''میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے''۔

اس مرتبہ مجھے خود اپنا لہجہ اجنبی لگ رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔

میاں جی کو شراب کے نشے میں سوائے میری جوانی کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے شاید ان باتوں کو بھی میری ادا جانا اور برآمدے میں پہنچ کر اپنی شہوت بھری آنکھوں سے گھورتے ہوئے میرا بازو پکڑ لیا۔

تمام بھولے ہوئے سبق مجھے یاد آ گئے۔ میں نے پاؤں میں پہنے سینڈل کی ایڑی اس زور سے اس کی پنڈلی پر ماری کہ وہ درد سے بلبلانے لگا اور جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری گھومتی ہوئی لات اس کی پسلی میں لگی اور وہ برآمدے کی دیوار سے جا ٹکرایا... ان دو ضربوں نے ہی اس کا نشہ ہرن کر دیا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ یقیناً بہت غیر متوقع اور اچانک تھا۔

حیرت تکلیف اور غصے کے ملے جلے تاثرات لئے وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا لیکن میں اسے سنبھلنے کی مہلت ہی دینا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس سے اتنی شدید نفرت تھی کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا بھی گوارا نہیں کیا۔ میری دونوں ٹانگوں میں بجلیاں بھر گئیں اور باری باری وہ میاں کی پسلیاں بجانے لگیں۔

دوسرے تیسرے وار ہی میں وہ برآمدے سے لڑھک کر نیچے جا گرا۔ خوف کے مارے اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

''بٹی۔ بٹی! رک رک۔ کیا کر رہی ہو۔''

اس نے گھگھیاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

''نکل جاؤ۔ ورنہ تمہارا خون پی جاؤں گی۔''

میں نے دھاڑتے ہوئے کہا اور وہ ''اچھا! اچھا جاتا ہوں۔'' کہتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

میاں کی پٹائی کرنے کے بعد میں خاصا روحانی سکون محسوس کرنے لگی تھی۔ یوں لگا جیسے جسم کے بند بند کو مزا آ رہا ہو۔ ڈرائنگ روم میں آ کر میں نے ٹیپ کا سوئچ آن کر دیا اور صوفے سے ٹیک لگا کر گانا سننے لگی۔

امی اور عابدہ کی آمد تھوڑی دیر بعد ہی ہو گئی۔

s.com

''میاں جی تو نہیں آئے تھے ادھر''۔

امی نے آتے ہی بے چینی سے دریافت کیا۔

''آیا تھا۔''

میں نے سکون سے جواب دیا۔

''پھر''؟

''میں نے باہر نکال دیا''۔

''کیوں؟''

امی دھاڑیں۔

''اس لئے امی کہ وہ کسی نیک ارادے سے یہاں نہیں آیا تھا۔''

میں نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''تیرا خانہ خراب ہو۔ ان سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی''۔

امی نے چیختے ہوئے کہا۔

''صرف دو چار ٹانگیں جمائی ہیں زیادہ نہیں۔ اس سے زیادہ کی اس میں ہمت بھی نہیں تھی۔''

میں نے اس طرح کہا جیسے میچ کا تذکرہ کر رہی ہوں۔

''اری ناخلف! کرموں جلی! تیرا ستیاناس ہو۔ تو نے میاں جی پر ہاتھ اٹھایا۔ تیرے ہاتھ نہ ٹوٹ گئے۔ اب تیرے باپ کو کون چھڑائے گا جیل سے۔ کون پالے گا تمہیں۔ تیرے باپ کے مربعوں سے پیسے آئیں گے کیا زندگی گزارنے کے لئے۔''

انہوں نے مجھے بددعائیں دینی شروع کر دیں۔ میں نے اُٹھ کر ٹیپ کا سوئچ آف کر دیا۔

HBC
urdufans.com

"امی! مجھے بدتمیزی پر آمادہ نہ کریں۔ میری طرف سے سارا گھر مر جائے۔ اگر کسی نے میری طرف میلی نظر سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھیں نکال دوں گی۔ خواہ وہ آپ ہی کیوں نہ ہوں۔"

میرا لہجہ اتنا خوفناک تھا کہ عابدہ تو سہم کر رہ گئی۔

امی بولتے بولتے رک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ انہیں شاید یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان کی مخاطب میں ہوں۔ نجمہ! ان کی بیٹی۔

تقریباً ایک منٹ تک میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انہیں گھورتی رہی۔ پھر پاؤں پٹختی وہاں سے باہر آ گئی۔

امی کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ مجھ سے انہوں نے کبھی یہ توقع تو نہیں رکھی تھی کہ میں کسی قسم کی بیہودگی برداشت کروں گی یا کبھی ان کے نظریات کم از کم عابدہ ہی کی حد تک اپناؤں گی لیکن اتنے جارحانہ رویئے اور اس طرح کھل کر مقابلے پر اتر آنے کی توقع انہوں نے مجھ سے نہ کی تھی۔

میرا یہ روپ ان کے لئے شاید اجنبی نہ ہونے کے باوجود چونکا دینے والا تھا۔ ان کی دانست میں کچھ بھی ہو آخر میری اوقات تھی ہی کیا؟ ایک کالج میں پڑھنے والی، ماں باپ کی محتاج، بے کس سی لڑکی، جو زیادہ سے زیادہ زبانی کلامی باتوں سے دل کی بھڑاس نکال سکتی تھی۔

یہ کہ میں مردوں کی طرح ہاتھ پاؤں بھی چلا سکتی ہوں، ان کے لئے بالکل نئی، انوکھی بات تھی۔ حالانکہ میری اس سلسلے میں شہرت ان تک پہنچ بھی چکی تھی۔ لیکن انہوں نے شاید اس بات پر یقین ہی نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ رات ہمارے گھر پر قیامت کی رات بن کر اتری۔ ممکن ہے ابو گھر پر ہوتے

ہوئے بات آگے بڑھتی لیکن میری امی کے نزدیک اس مسئلے کا واحد حل سوائے خاموشی کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟۔

صبح بے چینی سے میں نے اخبار میں اپنا رزلٹ دیکھا۔ میری اعلیٰ نمبروں سے فسٹ ڈویژن آئی تھی۔ سب سے پہلے میں نے بذریعہ ٹیلیفون آصف کو یہ خوشخبری امریکہ پہنچائی اور فوراً مقامی میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے درخواست دے دی۔ مجھے امید تھی کہ میرٹ لسٹ میں میرا نام آ جائے گا لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہاں "میرٹ" کا معیار وہ نہیں جو بتایا اور دکھایا جاتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد جب میں اپنا رزلٹ دیکھنے گئی تو یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری کہ میں چھ نمبروں کی کمی سے میرٹ لسٹ میں آنے سے رہ گئی تھی۔

یہ بڑا اندوہناک حادثہ تھا۔

بڑی جان لیوا خبر تھی... ! میرے لئے۔

ساری ریاضتیں، سب محنتیں اکارت گئیں۔ چھ نمبروں سے میں زندگی کی لڑائی ہار گئی۔

تو یہ تھا میرا انعام...... میری پاکیزگی، محنت، شرافت کا یہ ثمر ملا تھا مجھے کہ چھ نمبروں سے مجھے اعلیٰ تعلیم سے محروم کر دیا گیا کیونکہ "کوٹے کی سیٹوں" نے میرٹ بہت بڑھا دیا تھا۔

میری تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ خواب یوں بھی چکنا چور ہوتے ہیں یہ تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

آج سوچتی ہوں میری زندگی تباہ کرنے میں اس ظالم تعلیمی نظام کا کتنا زبردست عمل دخل ہے۔ اگر میرے شدید شوق اور پچھلے شاندار تعلیمی ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیمی پالیسیاں بنانے والے جھوٹے ناخدا مجھ پر رحم کر لیتے۔ میری آہ وزاری پر کان دھر کر مجھے چھ

HBC
urdufans.com

نمبروں کی رعایت سے مشروط طور ہی پر سہی میڈیکل میں داخلہ مل جاتا تو زندگی کبھی منفی راہیں نہ اختیار کرتی۔ شاید یہ تیرہ بختیاں میرا مقدر نہ بنتیں۔ کاش ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو ''کوٹہ سسٹم'' کی بھینٹ نہ چڑھایا جاتا۔

M UMER A ZEB
M.HAMZALA A ZEB
ABBOTTABAD
PAKISTAN

میں نے کس کس کی منت نہیں کی ....!

کس کس کو درخواست نہیں دی.... !

کہاں کہاں اپنی بے بسی اور غربت کا واسطہ نہیں دیا۔

کون سے در پر جھولی نہیں پھیلائی میں نے......!

محکمہ تعلیم کے ہر بڑے افسر کی چوکھٹ پر آنسو بہائے۔ رو رو کر فریاد کی۔ بین السطور میں اپنے گھریلو حالات کا احساس دلایا۔

لیکن کوئی دل نہ پگھلا۔ میرے لئے کسی نے آنسو نہ بہایا۔ کسی کو میری حالت پر رحم نہ آیا۔ ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔

''بی بی! ہم مجبور ہیں......''

''یہ قانونی معاملہ ہے۔''

''اس میں ہمارا گناہ نہیں۔''

جب میں نے ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی جن کے نمبر مجھ سے کم تھے اور انہیں داخلہ مل گیا تھا تو کہا گیا۔

''وہ تو فلاں کے کوٹے میں ہے۔''

زندگی سے میں نے جو بھی لڑائی لڑی اور ہار گئی۔ کوئی میرے کام نہ آیا کسی پر میری آہ و فغاں نے اثر نہ کیا۔ کسی کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ اگر ''فلاں کے کوٹے'' کی ایک سیٹ ختم کر کے کسی حقدار کو داخلہ دے دیا جاتا تو ایک زندگی تباہ ہونے سے بچ جاتی۔

سوائے آصف کے اس دنیا میں اور کون تھا جو میرے دکھ درد کو محسوس کرتا۔ رزلٹ کے دوسرے ہی دن اس کا جوابی ٹیلی فون آیا۔ اس نے میری شاندار کامیابی پر مبارک باد دینے کے بعد لکھا تھا کہ ٹیلی فون کے ہفتہ بعد وہ فلاں فون نمبر پر جو اس کے ایک رشتہ دار کے گھر لگا ہوا تھا مجھ سے بات کرے گا۔ یہ فون نمبر ہمارے ساتھ والے گھر کا تھا۔ میں نے اُسے اپنے گھر کا فون نمبر نہیں دیا تھا اور جس گھر میں فون سننے آئی تھی وہ بہت شریف لوگ تھے لیکن مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا کہیں امی کو علم نہ ہو جائے جس پر آصف نے مجھے یہ نمبر دیا تھا۔

یہ مبارکباد مجھے اس وقت ملی تھی جب مقامی اور ملک کے دوسرے میڈیکل کالجوں کی میرٹ لسٹ میں میں آنے سے رہ گئی تھی اور جس روز میں آصف سے فون پر بات کرنے اس کے عزیز دوست کے گھر پہنچی ارباب بست و کشاد کی طرف سے بھی مایوس ہو چکی تھی اور ناکام انسانوں کی طرح اب کسی معجزے کی اُمید لگائے بیٹھی تھی۔

میری حالت فی الوقت سزائے موت کے اس مجرم جیسی تھی جس کے بلیک وارنٹ سائن ہو چکے تھے۔ تمام اپیلیں رد ہو چکی تھیں۔ رحم کی درخواستوں کو جواب مل گیا تھا جو موت کے تختے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بھی اس بات کی امید رکھتا ہے کہ کوئی انہونی کوئی معجزہ ابھی کسی بھی لمحے کسی بھی پل رونما ہو کر اُسے بچا لے گا۔

لیکن معجزے نہیں ہوتے۔ کوئی بچانے والا نہیں آتا اور وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کو نہیں ہونا چاہئے۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے غیر ملکی کال کا مژدہ سنایا۔ اس کا دوست مجھے فون تھما کر خود باہر نکل گیا۔

''ہیلو۔ نجمہ کیسی ہو۔''

HBC
urdufans.com

اس کی انبساط میں ڈوبی آواز ہوا کے دوش پر سفر کرتی میری سماعت کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

"آصف!"

میرے لفظ سسکیاں بن گئے۔

"ارے بیوقوف پانچ سات منٹ کی مہلت نصیب ہوئی ہے۔ یہ گھڑیاں کیا رو کر بتانے کی ہوتی ہیں۔"

اس نے بظاہر مذاق میں بات ٹالنا چاہی لیکن اس کی دلی کیفیت کیا تھی اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتی تھی۔

"مجھے کہیں داخلہ نہیں مل رہا۔ کہیں نہیں۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔

"کیوں؟"

"میرٹ لسٹ میں آنے والوں کے نمبر مجھ سے زیادہ ہیں اور "کوٹے کی سیٹیں" اس سے بھی زیادہ۔"

میں نے روہانسی ہو کر کہا۔

"ارے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ پھر تیاری کرو۔ اگلے سیشن میں داخلہ لینا۔ چھ ماہ ہی کا وقفہ تو ہے اور چھ ماہ چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔"

اس نے گلا پھاڑ کر تسلی دی۔

"آصف مجھ سے نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ بس اب میں ہار چکی ہوں۔"

میرے آنسو تھے کہ بہے چلے آتے تھے۔

"اچھا بھئی۔ ٹھیک ہے بی۔ اے کر لو۔ بی ایس سی کر لو۔ جیسی تمہاری مرضی۔

مجھے تم بہر صورت قبول ہو لیکن خدا کے لئے رونا دھونا چھوڑ دو۔ اور ہاں کوئی بیلٹ ویلٹ بھی ملی ہے یا بس یوں ہی۔"

اس نے میرا موڈ بدلنے کے لئے مقدور بھر کوشش کی۔

ہزاروں میل کی دوری پر بھی اس نے اپنے فرض کو بھلایا نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ میری مسیحائی کر رہا تھا۔ اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر بھی وہ مجھے ہر حالت میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اوہ آصف...... کتنے عظیم تھے تم......!

"آصف...... میں...... میں......" میرے منہ سے الفاظ بمشکل ہی نکل پائے تھے جب لائن کٹ گئی۔

ٹائم ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ٹوٹے بازو سے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

جیلر نے ملاقات کا وقت ختم ہونے کی منادی کر دی تھی اور موت کی راہ کے مسافر کی الوداعی ملاقات ہو چکی تھی۔ پھر اس کے بعد فلک نے یوں کبھی اس سے ملنے نہ دیا۔ خوشیوں کے لمحات اپنا بستر سمیٹ کر رخصت ہو گئے۔ بس میرے مقدر کے حصے کی خوشیاں اتنی ہی تھیں۔ یہ بھی شاید کسی اور کا حصہ ہوگا جو کہ تب تقدیر نے میری طرف نجانے کیوں منتقل کر دیا تھا۔ بھلا میں ان خوشیوں کے لائق تھی ہی کب؟

"بیٹھئے۔ میں آپ کے لئے چائے لاتا ہوں۔"

آصف کے دوست نے مجھے باہر نکلتے دیکھ کر مخاطب کیا۔

اس کے دوست بھی اس کی طرح اونچے آدرشوں کے مالک عظیم انسان تھے۔ اتنے عظیم شخص جن کی یہی خواہش رہتی کہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی سکھ تو حاصل ہو جائے۔

"شکریہ بھیا۔ میں چلتی ہوں"۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"بہن جی! اس گھر کو اپنا گھر ہی جانئے۔ میں آصف کا کلاس فیلو ہوں۔ جب

کبھی دل چاہے تشریف لائیے۔ اپنے دوست کے کسی بھی عزیز کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی''۔

اس نے نظریں جھکائے جھکائے میری طرف دیکھے بغیر مجھے خطاب کیا۔

''شکریہ بھائی!''

میں نے گھمبیر آواز میں کہا اور اس کی اگلی بات سنے بغیر تیزی سے باہر نکل آئی۔ مجھے یوں دکھائی پڑتا تھا کہ اگر یہاں تھوڑی دیر کے لیے اور رک گئی تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو نڈھال ہو چکی تھی۔ بے دم سی ہو کر بستر پر گر پڑی۔ اس رات میں نے اپنا تکیہ اپنے آنسوؤں سے بار بار بھگویا ... میں ایسے روئی جیسے ساون کا بادل ٹوٹ کر برسا کرتا ہے۔ شاید میرے بس میں اس کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ گھر کے حالات اب آہستہ آہستہ بدل رہے تھے۔ میاں سے ناراضگی مول لے کر ہم اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ بھی شاید امی سے اب جان چھڑانے کے چکر میں کسی بہانے کی تلاش میں تھا کیونکہ امی کا دم خم اب ٹوٹ رہا تھا۔ پہلے والی رونقیں دم توڑنے لگی تھیں اور ابو کی ضمانت کے امکانات ختم ہو رہے تھے۔ سرخی پاوڈر کی لیپا پوتی سے میاں جیسے خبیث لوگ متاثر نہیں ہوتے تھے کیونکہ امی سے اس کے تعلقات کی جو نوعیت تھی وہ ایک خاص حد تک ایک خاص مدت تک ہی چل سکتی تھی۔ اب خود امی نے اسے اپنے جیسی کئی ''زہرہ جمالوں'' سے متعارف کروا دیا تھا اور میاں نے کہ ایسے معاملات پر خوب دسترس رکھتا تھا۔ تعارف کو تعلقات اور پھر مراسم کی ...ل تک لے جانے میں بڑی عجلت دکھائی تھی۔ وہ میدان حرص و ہوس کا پرانا اور منجھا ہوا شہسوار تھا۔ عورت کو خصوصاً درمیانے طبقے کی ان عورتوں کو جو راتوں رات امیر ہونے کے

HBC
urdufans.com

خواب دیکھ رہی ہوں، شیشے میں اتارنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ یہ عورتیں اس کا بہترین شکار ہوا کرتی تھی۔ اس کی زندگی اسی کھیل میں گزری تھی۔ وہ بڑی مکاری سے بڑی خباثت کے ساتھ اپنے متعارف کی کمزور نبض ڈھونڈتا اور اسے دبا کر اپنے گھناؤنے مقاصد کے لئے بروئے کار لے آتا۔ اس کھیل میں ماہر تھا وہ۔

زہراں کی بیٹی کے ہاتھوں اس کی درگت تو ایک بہانا تھا۔ جب سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب نیاز محمد کے بچنے کے امکانات نفتی نفتی بھی نہیں رہے اور کلچھرے اڑانے کے چانسز بھی ختم ہو چلے تو اس نے امی سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا کیونکہ صرف جسمانی مراسم تو اس کے زہراں جیسی نجانے کتنی عورتوں سے تھے۔ اسے کچھ اور بھی چاہئے تھا۔ حرام کی کمائی میں سے اپنا حصہ۔ روزانہ نئے نئے لوازمات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیا اور تازہ خون۔ جس کی امید کم از کم وہ اب اس گھر سے کبھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

میاں صاحب کا پتا کٹا تو امی کو کسی اور میاں کی تلاش ہوئی لیکن کھونے اور پانے کے درمیان کا وقفہ خاصا لمبا ہوتا جا رہا تھا کیونکہ ایسی عورتوں کو فصلی بٹیرے تو مل جاتے ہیں مستقل یاری پالنے والے نہیں ملتے۔ اس درمیانی وقفے میں امی نے نہ تو اپنا ''سٹینڈرڈ آف لونگ'' (Standard of Living) بدلا تھا نہ ہی ان کے لچھن بدلے۔

والد صاحب کو ''اچھی جیل کٹانے'' پر معمولی خرچ نہیں اٹھتا تھا۔ جیل سے متعلقہ حکام کی تمام جائز ناجائز فرمائشیں پوری کرنی ہوتی تھیں جس کے لئے بہرحال سرمایہ درکار تھا۔ ورنہ تو ''ملاقات'' ہی ناممکن بنا دی جاتی تھی۔

اب نوبت یہ آ چلی تھی کہ امی نے جمع پونجی خرچ کرنی شروع کر دی تھی۔ اور وہ سرمایہ بھی جو انہوں نے والد کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان سے چھپا کر الگ سے محفوظ رکھا ہوا تھا استعمال میں لانا شروع کر دیا کیونکہ والد کے مقدمے، عدالت، کچہری پر تو جو۔

playing at the national career ... to extend his inter-

خرچ اٹھ رہا تھا وہ اٹھ ہی رہا تھا خود امی کا ذاتی خرچ بھی نوابوں کی بیگمات سے کم ہرگز نہ تھا۔ نئے سے نیا میک اپ کا سامان، کپڑے، ساڑھیاں، خوشبویات اور دیگر الم غلم، ان کا ذاتی آرائش وزیبائش کا بل کسی فلم کی ہیروئن سے کم ہرگز نہ ہوگا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں آصف مجھے اگلے سیشن میں داخلہ لینے یا مزید تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

ساری رات یہی سوچ کر میری نسیں ٹوٹتی رہیں کہ میں اس کی توقعات پر پوری اتروں تو کیونکر؟ اور اگر پوری نہ اتروں تو کیا اس کی محبت برقرار رہ سکے گی۔

☆☆☆

ڈھلتی عمر کی طوائفوں کا سرمایہ حیات عموماً ان کی جوان چھوکریاں ہوتی ہیں۔ امی نے کھل کر کبھی اپنے طوائف ہونے کا اقرار نہیں کیا نہ ہی انہوں نے کوئی کوٹھا سجایا لیکن ان کے لچھن "مہذب طبقے کی طوائف زادیوں" سے کم کبھی نہ تھے اور ہمارا گھر بھی ہمیشہ ہی کوٹھی خانہ بنا رہا۔ اپنی دونوں بہنوں کے مقابلے میں جن کی بیٹیاں خوب خوب نام اور دام کما رہی تھیں۔ امی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس لحاظ سے وہ بدقسمت رہیں کہ اپنی متاع حیات کو اپنے راستے پر نہ چلا سکیں کیونکہ معاملہ مجھ سے شروع ہوتا تھا۔ جب میں ہی ان کے جال میں نہ پھنسی تو عابدہ کیسے پھنستی؟ اس حد تک تو عابدہ ان کے ساتھ تھی کہ وہ اسے شمع انجمن بنائے رکھیں لیکن یہ کہ کسی خلوت گاہ کو وہ روشن کرے اس بات کے امکانات صفر فی صد بھی بظاہر نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے کبھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ سختی سے نرمی سے ڈانٹ سے محبت سے ہر طرح میں نے اس کے لاشعور میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ مشرقی لڑکی کا واحد سرمایہ اس کی پاکیزگی اور کنوارہ پن ہے۔ اگر یہی نہ رہے تو وہ کوڑیوں کے مول بک جائے گی۔ ہماری "کزنوں" کی مثال اس ضمن میں کافی تھی۔

HBC urdufans.com

میری تربیت تھی، خدا کا فضل تھا کہ اس نے ماں کے ساتھ گھومنے پھ
پارٹیاں اڑانے سے تجاوز نہ کیا اور ایسے گھناؤنے اور بیہودہ ماحول میں بھی اپنا دامن عصمت بچا کر رکھا حالانکہ امی نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

دستور زمانہ کے مطابق امی کی نظریں بھی اب ہماری ہی طرف اٹھیں، لیکن میں نے تو "جارحیت" کی حد تک اور عابدہ نے زبانی کلامی ان کی بین السطور میں کی گئی ایسی کسی بات کا بھی فوراً منہ توڑ جواب دیا۔ وہ ہم سے اتنی امید ضرور رکھتی تھیں کہ ہم ان کی سربراہی میں کم از کم نوجوانوں کو بے وقوف تو بنا لیا کریں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی اس حد تک بھی جانے کو تیار نہیں تھا۔

ان حالات میں امی سے تعاون کی امید عبث دکھائی دیتی تھی اور وہی ہوا۔

صبح جب میں نے ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

"میری طرف سے تم جاؤ جہنم میں اور تمہاری ڈاکٹری بھی۔ ساری زندگی کا ٹھیکہ میں نے نہیں لے رکھا۔ گھر کا اثاثہ بیچ بیچ کر تمہارے اللے تللے پورے کر رہی ہوں۔ اب ماں کو بیچ دو کہیں۔ اری تو تو دوبارہ داخلے کا کہتی ہے۔ میرے پاس تیری مزید تعلیم کے لئے پھوٹی کوڑی نہیں۔ میری طرف سے جہاں جی چاہے جا۔ منہ کالا کر۔"

تھوڑی دیر تک سانس لینے کو وہ رکیں۔

"لڑکی! میں کہے دیتی ہوں۔ نوکری کر لے کہیں۔ اپنا اور بہن کا پیٹ پال۔ میرے پاس تمہارے باپ کے خرچوں سے کچھ بچے گا تو دوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ غور سے سن لے۔ تو بڑی حاجن بنی پھرتی ہے، تو اپنی ذمہ داری پوری کر۔ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے کہ تمہیں اور ہمیں سنبھالے گا۔ کما کر لا اور ہمیں کھلا......"

اتنا کہہ کر پیر پٹختی وہ گھر سے چلی گئیں۔

اسی نے تو فیصلہ دے دیا تھا لیکن میں کیا کروں؟ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آصف کی خواہشات کا احترام میرے لئے کیسے ممکن ہوگا۔ بغیر فیس کے مجھے کون سی کالج یا اکیڈمی میں گھسنے دے گا اور مجھ میں ایسا تھا کیا کہ کوئی ایسا کرے۔ یہی سوچ سوچ کر میں ہلکان ہو رہی تھی۔ کسی فیصلے پر پہنچنا ممکن نہیں تھا تین دن اور راتوں کے بعد بالآخر میں بدقسمتی سے ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔

زندگی کے تمام فیصلے ٹھنڈے دل و دماغ سے شاید اس لئے بھی نہیں کئے جاتے کہ آدمی خود نہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ کیونکہ انتظار خواہ فیصلے ہی کا ہو بڑا جان لیوا بن جاتا ہے۔ انسانی سائیکی میں کچھ ایسے منہ زور سرپھرے اور لاابالی لمحے بھی آتے ہیں جن میں صدیوں کی قوت بند ہوتی ہے۔ ان لمحوں میں آدمی جو سوچتا ہے، کہتا ہے، کر گزرتا ہے۔ انجام سے بالکل لاپرواہ ہوکر۔ ماحول سے اطراف سے بالکل بے گانہ ہوکر۔

یہ بڑے عجیب وغریب فیصلے ہوتے ہیں۔ یا تو آدمی فضاؤں میں اڑنے لگتا ہے یا پھر تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں بھی اسے پناہ نصیب نہیں ہوتی اور وہ ناکامیوں اور ذلالتوں کے آخری مدارج کو چھونے لگتا ہے۔

وہ بھی شاید ایسا ہی کوئی منحوس لمحہ ہوگا جب میں نے ماں کے چیلنج کو قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا اور خود سے کہا۔

''نجمہ بیگم تم ڈاکٹری اور آصف کے لئے نہیں بنیں۔ تمہاری قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا ہے اور خیریت اسی میں ہے کہ نصیب کے لکھے پر صاد کردو کہ تمہاری بغاوت ان آسمانی فیصلوں پر ذرا برابر بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی۔''

تین دن تک سوچ بچار کرنے کے بعد بالآخر ایک روز جھنجھلا کر میں نے ایک ... میں چھپے اشتہار کے مطابق نرسنگ میں داخلہ لے لیا......!

HBC
urdufans.com

میں نصیبوں جلی۔ ڈاکٹر بننے چلی تھی اور نرس بن گئی......!!

میرے ایف ایس سی کے نمبر، مطالعہ، قدبت، جسمانی صحت، علمیت کس کس کو کہاں کہاں رد کیا جاتا۔ فوراً داخلہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں گھر سے ہوسٹل پہنچ گئی جہاں بدبختیاں سیاہ کاریاں اپنا بھیانک جبڑا کھولے نجانے کب سے بانہیں پھیلائے میری منتظر تھیں۔ سب مجھ سے یوں ملیں جیسے صدیوں کے بچھڑے ایک دوسرے کو ملا کرتے ہیں۔

تضادات کی جس صلیب پر حالات نے مجھے شکار کیا تھا وہاں مجھے یہ گیان ضرور حاصل ہو گیا کہ زندگی کے وہ انگور جو سو بار اچھلنے کودنے پر ہمارے ہاتھ نہیں آتے اگر ہمارے منہ میں آ بھی جائیں تو ان کا ذائقہ نہیں بدل سکتا۔ وہ کھٹے ہی رہتے ہیں۔ عملی زندگی کا سچ کتابوں کے سچ سے بالکل الگ کسی چیز کا نام ہے۔

میرے اعزازات، درجہ اول کی سندیں، سکول وکالج کے انعامات کوئی مدارج نہیں تھے کہ میں ان کو پھلانگتی منزل تک جا پہنچوں۔ یہ تو منزلوں کے سراب تھے۔ آصف کی محبت جو مجھے ملی تھی، یونہی نہیں مل گئی تھی۔ اس کی تلاش میں میں نے بڑی آبلہ پائی کی تھی۔ بڑی صحرانوردی کی تھی، بڑے ٹیڑھے میڑھے، الجھے ہوئے، پیچیدہ اور نوکدار پتھروں والے راستوں پر ننگے پاؤں گھومی تھی۔ اگر سال دو سال کو مجھے راستے کے کسی موڑ پر، صحرا کے کسی کونے میں آصف کی رفاقت میسر آ ہی گئی تھی تو اس کی حیثیت اس نخلستان سے زیادہ ہرگز نہ تھی جہاں پل بھر کو یا گھنٹہ دو گھنٹے یا دو چار روز تک ستا کر مسافر سانس لے لیا کرتے ہیں۔ زندگی کے صحرائے اعظم میں بھٹکتے ہوئے اگر کہیں کوئی کنواں پھوٹ ہی پڑے، پتھریلی زمین سے اگر پانی نکل ہی آئے تو اس کی حیثیت کو دائمی مان لینا بے وقوفی ہوتی ہے۔ یہ کنویں کچھ وقت کے بعد خود بخود خشک ہو جاتے ہیں...... کہ یہی قانون قدرت ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

HBC
urdufans.com

اور نجمہ نے اس پر صاد کیا۔ !لبیک کہا !آمنا صدقنا کی صدا دی۔ کہ مکافات عمل سے فرار کب ممکن ہے؟

میں نے سوچا میں آصف کے قابل نہیں ہوں محبت صرف اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا نام نہیں۔ پھیلا ہوا ہاتھ نہیں کہ گزرنے والے اس پر خیرات کی اٹھنیاں چونیاں رکھتے گزر جائیں۔ چاہے جانے کی آرزو رکھنا الگ چیز ہے اور چاہنا بالکل الگ شے۔ میں نامطلوبی کی مہر بن کر کب تک آصف سے چمٹی رہتی۔۔ ؟

میں نے سوچا کیوں نہ خود کو اس پر نچھاور کر کے اپنی محبت کو عظمت کا روپ دے لوں کہ جب کبھی کھونے کا پچھتاوا مجھے رلائے تو خود کو طفل تسلی دینے کے لئے میرے پاس کم از کم "قربانی" کا ڈھکوسلا تو موجود ہو۔

یہ معمولی میثاق نہیں تھا جو میں خود سے کرنے جا رہی تھی۔ مجھے خود سے بڑی طویل جنگ لڑنا پڑی۔ ہیرے کا کشتہ کھرل کرنا من مارنے سے آسان ہے۔ اپنا اندر مارنے کے لئے۔ اپنے زہر کو خود چوسنے کے لئے بڑا جگرا بڑا ظرف درکار ہوتا ہے جو الحمدللہ میرے پاس تھا۔

میں نے آصف کی دنیا سے نکل جانے کا بے رحمانہ فیصلہ خود پر "تن کمانڈمنٹ" کی طرح نافذ کر دیا اور خود سے عہد کیا کہ کبھی ڈگمگاؤں گی نہیں۔ اس کی زندگی میں زہر گھولنے کا تصور ہی میرے لئے اندوہناک تھا۔

اس فیصلے پر ثابت قدم رہنے کے لئے میں نے خود سے بڑی لمبی جنگ لڑی۔ آصف کے خطوط آتے۔ پیغامات ملتے۔ پیار بھری دھمکیاں موصول ہوتیں ...وہ مجھے اپنے ۔۔ یاد دلاتا۔ مجھ سے کہتا تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں میں تمہیں پاتال کی تہہ سے ڈھونڈ نکالوں گا !تم بھاگ کر دکھاؤ تو سہی!

فرزانہ لکھتی: "باجی خدا کے لئے ایسا ظالمانہ فیصلہ نہ کیجئے۔ یہ یکطرفہ کارروائی ہے۔ یہ ظلم ہے۔ یہ بھیا کا انتظار کر لیجئے۔ آپ سکون کیسے پائیں گی۔ نہیں نہیں۔ یہ ظلم ہے۔ یہ خود کو مارنے کے لئے آپ نے بڑا اذیت ناک راستہ اپنایا ہے۔"

لیکن میں خاموش رہی۔ میں نے کسی کو کسی خط کا کسی بات کا جواب نہ دیا......

ایک روز اس کے بچپن کا ایک دوست مجھے ڈھونڈتا ہوا ہوسٹل ملنے آ گیا۔ جب چپڑاسی کسی عزیز صاحب کے نام کی چٹ لایا تو میں حیران رہ گئی۔ پھر مجھے اس کا نام یاد آ گیا۔ میں نے اس کی چٹ کے پیچھے لکھ کر بھیج دیا۔ "میں آپ کو نہیں جانتی"......لیکن وہ ملنے پر بضد رہا۔ اس نے میری میٹرن کی منت سماجت کر کے مجھے دفتر میں ملاقات کے لئے آمادہ کر لیا۔

"باجی! خدا کے لئے اتنی کٹھور نہ بنئے۔ اتنی سنگدلی آصف کو مار ڈالے گی۔ آپ دو زندگیاں ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ آپ کا ضمیر آپ کو کیسے معاف کرے گا ....؟"

"مسٹر میں کسی کو نہیں جانتی۔ چلے جایئے اور خدا کے لئے آئندہ کبھی مجھ سے ملاقات کرنے نہ آیئے۔ سب سے کہہ دیجئے کہ نجمہ مر گئی۔"

اور اس کا اگلا جواب سنے بغیر میں بھاگتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی۔ حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ اب مجھ میں نہیں رہا تھا۔

وہ رات میں نے سسکیاں لے لے کر گزاری۔ میں نے رو رو کر خدا کے حضور التجائیں کیں کہ مولا! مجھ پر رحم کر۔ اگر میں اپنے وعدے سے ہٹ گئی تو بہن کی زندگی کو روگ لگ جائے گا۔ کم از کم مجھے اپنی بہن کو بچانے کے لئے ہی ہمت اور استقامت عطا فرما دے۔"

اور......!

urdufans.com

جس روز مجھے آصف کا وہ خط ملا جس میں لکھا تھا:

''بے وفا، دغاباز، مجھے تو یورپ اور امریکہ کی چکاچوند بھی متاثر نہ کرسکی ۔ میرا حوصلہ تو بڑی بڑی کافر ادا فاحشہ عورتوں کے سامنے بھی نہ ٹوٹا...... اور تم...... تم نے اتنی جلدی سب کچھ بھلا دیا...... جس روز تم اس کالے جادو کے چکر سے نکلو گی تب دیکھنا کیا ہوگا...... اور ہاں میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔

تمہارے بغیر بھی زندہ رہنا آتا ہے مجھے...... دیکھ لینا۔ میں مروں گا نہیں...... جی کے دکھاؤں گا تمہیں''......

میں نے خط پڑھا اور اپنی پائمال اور شکستہ روح کے کھنڈرات پر بیٹھ کر خود پر مسکرا دی...... میں نے اپنا عہد پورا کر دیا تھا۔ آصف کو اپنی جھوٹی بے وفائی کا یقین دلا دیا تھا۔

اس روز میری حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ میں خود بخود کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی رو دیتی......!

اللہ! ایسی بے بسی بھی کسی کا مقدر نہ ہو۔ ...کوئی یوں کسی سے مل کر نہ بچھڑے۔ یہ سچ ہے کہ جدائی سے موت نہیں آتی لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ جدا ہو کر جیا بھی نہیں جاتا۔

☆☆☆

میری ملازمت پر اگر کسی کو خوشی ہوئی تھی تو وہ واحد ہستی میری ماں تھی۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ میری ماں کو نرسوں سے متعلق خاصی خوش فہمی رہی تھی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ یہ نرسیں کم اور فاحشائیں زیادہ ہوتی ہیں۔ سفید لباسوں کے نیچے اپنے سیاہ اور گناہگار سراپے چھپائے پھرتی ہیں۔ کب تک میں ان سب کے درمیان رہ کر خود کو ان کے رنگ میں رنگنے سے بچوں گی۔ کبھی نہ کبھی تو بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنے ہی ہوں گے۔

اپنے اس زعم میں میری ماں کسی حد تک سچی بھی تھی۔ پہلے چار پانچ ماہ دوران ٹریننگ ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ تمام افواہیں جو اس مقدس پیشے سے متعلق لوگوں میں پرورش پا رہی ہیں کافی حد تک سچی ہیں۔ دیہات کی معصوم لڑکیوں کو شیطان عورتوں کا روپ دھارنے میں یہاں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ یہ تو گناہوں کی ایسی کال کوٹھڑی تھی کہ جو بھی اس میں ایک دفعہ پھنستا پھر روسیاہ ہو کر ہی باہر آتا تھا۔

پراسرار لوگوں، مکروہ شکل عورتوں کی آمدورفت کا مطلب مجھے جلد ہی سمجھ آنے لگا۔ ہوسٹل کے باہر شام گئے کار آ کر ٹھہرتی اور میری کوئی کورس فیلو چپ چاپ ایک کونے سے برآمد ہو کر اس میں بیٹھ کر چل دیتی۔

یہاں کے چپڑاسی، چوکیدار سب شیطان کے چیلے تھے لیکن شیطانوں کی یہ منڈلی بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ انہوں نے پہلے پہل مجھ پر بڑے دلفریب اور خوبصورت جال پھینکے جن میں ایسی کشش تھی کہ مچھلی خود بخود ان کی طرف کھنچی چلی جاتی۔

ان کے کانٹے سے لگے شکار پر کسی مچھلی کا نہ جھپٹنا اچنبھے کی بات تو تھی لیکن ناممکن ہرگز نہ تھی۔ میں نے ان تقدس مآب آدم زادیوں کو بھی دیکھا تھا جن کے بالوں میں کھچڑی پک رہی تھی جو کنواریاں تھیں اور اپنے کنبوں کو پالنے کے لئے جنہوں نے یہ مقدس پیشہ اپنایا تھا ان کی پاک دامنی کی قسمیں فرشتے بھی کھاتے تھے۔ جن راستوں میں وہ گزرتیں میلی نظریں بھی جھک کر ان کے حضور نذرانہ عقیدت گزارتیں۔ وہ صحیح معنوں میں اس عظیم پیشے کی آبرو تھیں۔

میرا واسطہ ان حوا زادیوں سے بھی رہا جن کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں لیکن جو جنسیت کی مکروہ ترین تصویریں بنی گھوم رہی تھیں۔ ان کے بظاہر معصوم چہرے بھی اپنے پر لکھی دعوت گناہ نہ چھپا سکتے۔ وہ وظیفہ خوار نرسیں تھیں اور شہر کے امیر ترین ڈاکٹروں سے

urdufans.com

زیادہ کماتی تھیں۔

اور یہی توقع میری ماں کو مجھ سے تھی۔۔۔!

''فلاں نرس دیکھ لو گھر پر وی سی آر رکھا ہے۔''

''فلاں نے کس ٹھاٹ سے اپنی بہن کو بیاہا ہے۔''

''فلاں نے اپنا مکان خریدا ہے۔''

لیکن میں نے ایسے فقرے ہمیشہ اس کان سے سنے اور دوسرے سے نکال دیئے کہ یہ میری ماں کی فطرت تھی اور انسانی فطرت جبلت کی طرح کبھی بدلتی نہیں۔ کتے کی دم جتنے سال جی چاہے نلکی میں رکھیے وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ حالات و واقعات نے ہمیں ایسی ایسی پٹخنیاں دی تھیں کہ اگر عقل یا شرم نام کی کسی بھی چیز سے والدہ کی آشنائی ہوئی تو وہ تائب ہو چکی ہوتیں لیکن ان کی فرعونیت تو بڑھتی ہی گئی۔

مجھے اپنی ماں کو دیکھ کر وہ جواری یاد آتے تھے جو زندگی بھر کی جمع پونجی محض اس امید پر لٹا دیتے ہیں کہ شاید اگلا داؤ ان کی پچھلی گئی ہوئی رقم واپس لوٹا دے گا ۔۔۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ ۔۔۔سو سو روپیہ کر کے وہ لاکھوں روپے ہار جاتے ہیں اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

یہ شیطان کا کمال ہے کہ وہ اپنے راستے کے مسافروں کو ہوس کی ایسی چاٹ لگا دیتا ہے کہ پھر مرتے دم تک وہ اس کے اسیر رہتے ہیں۔

میرے والد صاحب جیل میں قید کاٹ رہے تھے۔۔۔۔۔ ان پر لگے الزمات سچ ثابت ہو چکے تھے۔ میری والدہ نے اپنی مختلف ''بھانجیوں'' ''بھتیجیوں'' کے ذریعے بڑے بڑے افسروں تک رسائی حاصل کی تھی لیکن کسی نے اپنا دامن نہ پکڑایا۔ وہ بھی منجھے ہوئے کھلاڑی تھے ای کی بھتیجی گئی ہر ''بھانجی'' اور ''بھتیجی'' کو وہ دل کی گہرائیوں سے

خوش آمدید کہتے۔ اس کی اداؤں پر فریفتہ ہونے کی اداکاری کرتے۔ ای کی توقعات کے مطابق ان سے اپنے نہاد کرماتے۔ اس کے عوض چھوٹے موٹے ناجائز کام بھی ای ان سے لے لیا کرتیں تحائف بھی وصول ہوتے لیکن جب کبھی ابو کا ذکر ہوتا تو وہ اسے بڑا خطرناک مسئلہ کہہ کر معذرت کر لیا کرتے۔ لیکن ای نے ہمت نہیں ہاری تھی اور ہارتے ہوئے جواری کی طرح ابھی تک داؤ لگا رہی تھیں۔ اس روز انہوں نے اچانک میری سماعت پر یہ کہہ کر دھماکہ کیا کہ انہوں نے بڑی منت سماجت کے بعد میاں جی کو گھر آنے پر رضامند کر لیا ہے

''بڑی معافیاں مانگ کر سرکار کو منایا۔ وہ تو آنے کو تیار ہی نہیں تھے میں نے بتایا کہ نجمہ دفع ہو گئی ہے۔ اب یہاں نہیں رہتی تب کہیں جا کر آنے کو راضی ہوئے۔'' یہ بات انہوں نے عابدہ سے کہی تھی۔ لیکن میرے کانوں تک پہنچی تو جیسے میرے کلیجے پر چھری سی چل گئی۔

کیا تاریخ پھر خود کو دہرائے گی؟ پھر وہی گھناؤنا کھیل یہاں شروع ہونے والا ہے؟ میری سب محنتیں، قربانیاں کیا اکارت جائیں گی؟

لیکن میرے سوچنے یا کڑھنے کی نہ تو فلک کو پرواہ تھی نہ زمین کے باسیوں کو۔

ایک روز مجھے عابدہ نے بتایا کہ پچھلے بدھ کو میاں گھر آیا تھا اور اگلے بدھ تک ابو ضمانت پر باہر آ جائیں گے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مل ملا کر ابو کے کیس کی فائل ہی غائب کروا دے گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔۔ اور اس نے یہ کر دکھایا۔ بڑا خطرناک شخص تھا۔ خدا جانے کتنے لمبے ہاتھ تھے اس کے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک روز ای نے ''نیاز محمد کی آمد'' کا اعلان کر دیا اور شام کو ابو گھر آ گئے۔

انہوں نے باری باری ہمیں گلے لگا کر ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا اور یقین دلایا

HBC
urdufans.com

کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ دنوں میں گھر کے حالات بدل کر رکھ دیں گے کیونکہ میاں جی کے ہوتے کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ابھی تک ان کی ذہنیت نہیں بدلی تھی۔ ان کے لچھن وہی تھے۔ میں کٹ کر رہ گئی۔ اس سے پہلے تو میں کبھی کبھار گھر آ بھی جایا کرتی تھی۔ جب ابو اور میاں کی واپسی ہوئی تو میں نے اپنی آمد و رفت میں بہت کمی کر دی۔ ایک عابدہ کی فکر مجھے کھائی جاتی تھی۔ اس نے ایف۔ اے میں داخلہ لیا ہوا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کسی روز خدانہ کرے وہ بھٹک نہ جائے۔ لیکن اس نے اپنے کردار اور عمل سے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس نے میری بات کو پلے باندھا ہے اور کبھی غلط راستہ نہیں اپنائے گی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اس نے امی کا راستہ اپنایا تو میں خودکشی کر لوں گی کیونکہ اب میرے پاس زندہ رہنے کے لئے اور کوئی بہانہ باقی نہیں بچا لیکن عابدہ نے جو کہا کر کے دکھایا وہ گندے تالاب میں کنول کے مقدس پھول کی طرح زندگی بسر کر رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے گی

ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ بھی یونہی گزر گیا۔ اس دوران امی نے نیا شگوفہ چھوڑا۔

''بیٹی! تم نرسنگ میں باہر چلی جاؤ۔ یہاں کیا رکھا ہے تمہارے لئے۔ تنخواہ سے تو تمہاری اکیلی زندگی بھی مشکل سے گزرے گی۔''

''آپ میری زندگی کی فکر نہ کیا کریں۔ جیسے تیسے گزر ہی جائے گی۔'' میں نے جل بھن کر جواب دیا۔

''تیری مرضی ہے بیٹی۔ پہلے تو نے کون سی میری کوئی بات مانی ہے۔'' انہوں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

ان دنوں آئے روز نرسیں مڈل ایسٹ کے ممالک میں نوکری کے لئے جاتی رہتی تھیں۔ سرکاری اور غیر حکومتی سطح پر کئی ادارے اس سلسلے میں سرگرم عمل تھے لیکن میں نے کبھی

اس مسئلے پر غور ہی نہ کیا کیونکہ عابدہ کو کسی منزل تک پہنچا ہوا دیکھے بغیر اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

☆☆☆

زندگی معمول کے مطابق رینگ رہی تھی۔ ایک روز جب میں ڈیوٹی ختم کر کے ہوسٹل اپنے کمرے میں پہنچی تو ایک خط میرے نام آیا پڑا تھا۔ میں نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا کیونکہ تحریر عابدہ کی تھی۔

''باجی!

اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ پر جو کچھ گزرے گی اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتی ہوں۔ آپ مجھے بے شرم، بے حیا، بے وفا بہت کچھ کہیں گی لیکن خدارا پہلے میرا کیس سن لیجئے۔ اس کے بعد مجھ پر کوئی دفعہ لگائیے۔

باجی! میں نے آج تک کئی معاملات آپ سے محض اس لئے چھپا رکھے تھے کہ میں یہ کبھی نہیں چاہتی تھی کہ اپنی ایسی عظیم بہن کو جس نے صرف میری خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے مزید کوئی دکھ پہنچاؤں۔ کاش میں آپ کی طرح مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتی......!

باجی! شاید آپ نہیں جانتیں کہ امی نے میاں جی کے توسط سے میرا رشتہ ایک کروڑ پتی رنڈوے کے ساتھ کرنے کی حامی بھری تھی اور اس سلسلے میں میاں سے خاصی رقم بھی وصول کر چکی تھیں۔ یہ ایک بوڑھا زمیندار ہے جس کا مشغلہ ہم جیسی لڑکیوں کو بیویاں بنانا اور مروا دینا یا طلاق دے دینا ہے۔ اشتاق سے میری آشنائی ایک سال پرانی ہے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ آپ کی یہ گناہگار بہن اس معاملے میں بہت خوش قسمت تھی کہ اس کا محبوب نہ صرف اس پر جان دینے والا بلکہ اس کے لئے ہر مقابلے پر ڈٹ جانے والا

HBC
urdufans.com

بھی ہے۔ اشفاق اپنے پڑھے لکھے والدین کا اکلوتا بیٹا اور بزنس مین ہے۔ اس کے گھر والوں کو اس پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا مجھے آپ پر ہے۔ میں نے ان تمام حالات کا ذکر اس سے کیا۔ وہ تو پہلے ہی مجھے اس گندے ماحول سے نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے ہی بی۔ اے کی ضد پکڑ رکھی تھی۔

باجی وہ مجھے اپنے والد کے پاس لے گیا۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے میری ساری رام کہانی سن کر کہا کہ بیٹی پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ یہ معمولی فیصلہ نہیں۔ میں نے ان کے بضد ہونے پر بار بار سوچا اور اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ انہوں نے مقامی مجسٹریٹ کے روبرو میرا بیان قلمبند کروایا اور بڑے پروقار طریقے سے اپنے گاؤں لیجا کر اشفاق کا اور میرا نکاح کر دیا۔

ہم دونوں میاں بیوی اب اسی گاؤں میں حالات کے سدھرنے تک قیام کریں گے۔ پھر ہم دوسرے شہر منتقل ہو جائیں گے۔ میری کہانی کی صداقت کا ثبوت صرف یہ ہے باجی کہ میں آپ کو اپنا ایڈریس لکھ رہی ہوں تاکہ آپ خود دیکھ لیں آپ کی بہن کا فیصلہ غلط تھا یا صحیح۔ !

باجی...... خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں صرف یہ جان کر کہ آپ کی طرح میں حالات کا مقابلہ نہ کر پاتی اور جیتے جی مر جاتی۔ آخر میں اپنی چھوٹی بہن کی التجا بھی سن لیں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے بے شک زہر دے دینا لیکن خدا کے لئے ابھی امی یا ابو کو میرا ایڈریس نہ دیں۔

اشفاق اور ان کے گھر والے بھی میری طرح بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا کرے زندگی میں مجھے کوئی ایسا موقع میسر آجائے کہ میں آپ کے احسانات کا کچھ بدلہ اتار سکوں۔

''معافی کی خواستگار آپ کی نالائق بہن عابدہ''

☆☆☆

عابدہ کا خط پڑھ کر نہ تو مجھے خوشی ہوئی نہ ہی دکھ پہنچا۔ وہ ابھی اتنی ہوشیار نہیں ہوئی تھی کہ کسی صحیح نیت کا اندازہ کر سکتی۔ میرا جی چاہا کہ اڑ کر اس تک پہنچ جاؤں لیکن فی الوقت میں نے اس مسئلے پر خاموشی ہی مناسب سمجھی اور اس معاملے کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا۔

اگر وہ سب کچھ صحیح تھا جو عابدہ نے لکھا تو وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی اور اللہ میری محنتیں راس لے آیا تھا۔ میں نے خط پر لکھا ایڈریس اپنی ڈائری میں نوٹ کیا اور خط جلا کر ضائع کر دیا۔

دوسرے ہی روز امی ہوسٹل آن دھمکیں۔

''کچھ عابدہ کی خبر بھی ہے؟''

انہوں نے چھٹتے ہی کہا۔

''میرا خیال ہے اس بات کا جواب بھی آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ کیوں کیا ہوا؟''

میں نے بالکل انجان بنتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''وہ چھنال پچھلے چار روز سے غائب ہے۔''

امی غصے سے کھول رہی تھی۔

''اور آپ آج میرے پاس تشریف لا رہی ہیں؟''

میں نے اپنے لہجے کی کاٹ میں کمی نہ آنے دی۔

''میں نے سمجھا شاید کہیں......''

''جی ہاں! آپ کو اس سے زیادہ سمجھ بھی کیا آ سکتی تھی۔ لیکن آپ گھبرائی ہوئی

urdufans.com

یوں ہیں۔ وہ تو دادی مرحومہ کی نہیں آپ کی تربیت یافتہ ہے۔"

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ارے بی! میرے تو نصیب پھوٹ گئے۔ تم نے کبھی مجھے ماں نہ سمجھا اور وہ مجھے چھوڑ کر کسی یار کے ساتھ منہ کالا کر گئی۔" انہوں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ تم تو پہلے بھی یہی چاہتی تھیں۔ خیر میں بھی ملک دین محمد کی بیٹی ہوں۔ اُڑا لے چار دن گلچھرے۔ یہ لونڈوں کی یاریاں چار ہی دن کی ہوتی ہیں۔ جس روز یار کا دل بھر گیا وہ دھکے دے کر نکال دے گا اور میں ... میرے لئے تو وہ مر چکی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے رونا شروع کر دیا۔

"اچھا خدا کے لئے یہاں رونے دھونے مت۔ کیوں تماشہ دکھائیں گی سب کو۔"

میں نے ان کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ وہ غصے میں مجھے بددعائیں دیتی باہر نکل گئیں۔ دروازے تک میں انہیں چھوڑنے آئی تو یہ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا کہ باہر ایک کار میں میاں جی پچھلی سیٹ پر بیٹھا میری ماں کا منتظر تھا۔ امی اطمینان سے دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

میں نے اپنے طرز عمل سے امی کے لئے قطعاً شک کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اور یوں بھی انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ میں ان کے متعلق کیا نظریات رکھتی ہوں لیکن ایک خوف دامنگیر ہونے لگا...... کہیں میاں جیسا شیطان اس مسئلے میں مداخلت نہ کرے۔ مجھے امی کے جانے کے بعد دھڑکا لگا رہا......

شام کو ڈیوٹی آف ہونے کے بعد میں گھر آئی جہاں چنڈال چوکڑی جمی ہوئی تھی۔ وہ لوگ عابدہ کی گمشدگی پر بحث کر رہے تھے۔ عابدہ کی عقل پر میں عش عش کر اٹھی۔ اس نے اس معاملے کی ہوا مجھے ہی نہیں گھر کے کسی فرد کو بھی لگنے نہیں دی تھی۔ وہ اصل میں تھی ہی بہت سمجھدار لڑکی۔

جس روز میں نے امی کے ساتھ پہلی جھڑپ لی تھی اور ان کے "نوجوان دوستوں" کو اپنے کمرے سے باہر نکالا تھا اس روز کے بعد اس کے رویے میں یکسر تبدیلی آ گئی تھی۔ اس نے مستقبل کے لئے اسی دن سے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

بے چاری تھی تو عورت۔ جیسے ہی کوئی مضبوط سہارا میسر آیا اس نے میری طرح اسے کھونے کے بجائے فوراً خود کو پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرا دیا۔ قدرت خود بھی اس پر مہربان رہی اور اس کے لئے بہتر اور سازگار حالات پیدا ہوتے گئے۔ امی کا اس کو ایک طرح سے فروخت کرنا اس کی بہتری کا بہانہ بن گیا اور اس نے بجائے حالات کا

HBC
urdufans.com

واردات کر سکے۔''

اس نے مرغے کی طرح گردن پھیلائی۔

''یار نیاز محمد! پہلی بات تو میں نے مذاق میں کر دی تھی۔ واقعی میاں جی بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

ملک شرمندگی سے بولا۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ملک جی! وہ نظام دین کی لڑکی والا کیس بھول گئے تم لوگ۔ آخر میاں کی بات ہی سچ نکلی۔ اب دیکھ لو۔ کیسی سیدھی ہے لڑکی۔ مجال ہے جو کبھی سوچ بھی غلط ہو۔''

اس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ باقاعدہ گروہ کی شکل میں اس مکروہ دھندے سے منسلک ہیں اور کسی بدقسمت لڑکی کے فرار کو پہلے بھی ناکام بنا چکے ہیں۔

مجھ پر ''نظر رکھنے'' کے لئے وہ جو اقدامات کرنے والے تھے ان کی تفصیل اب طے ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے والد کو کسی کام سے اٹھتے دیکھا تو دبے پاؤں دروازے سے باہر نکل آئی اور آواز کرتی ہوئی دوبارہ اس طرح واپس آئی جیسے میں ابھی باہر سے اندر داخل ہوئی ہوں۔

میرے قدموں کی آہٹ پر والد میری طرف متوجہ ہوئے۔

''کچھ پتہ چلا ابو؟''

میں نے ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس طرح ان سے پوچھا جیسے میں اس مسئلے میں ان سے زیادہ پریشان ہوں۔

یہاں معاملہ اگر باپ بیٹی والا ہوتا تو کوئی بات تھی۔ میرے باپ نے تو اپنی نسوانی شرافت کو دھتکار کر خود کو اس طرح ماں کے رنگ میں رنگا تھا کہ جیسے وہ تھا ہی انہی

میں سے اور غلطی سے زندگی کے بیس پچیس سال اس نے اپنے والدین کے ساتھ بسر کئے تھے۔

''جائے گی کہاں...... میرا نام بھی نیاز محمد ہے۔ ایک دفعہ پتہ چل جائے۔ اگر اس کی اور اسے خوار کروانے والے دونوں کی ٹانگیں تڑوا کر گھر میں نہ ڈال دوں تو اپنے باپ کا جنا نہ بتانا......''

اس نے خالص پولیس والوں کے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے مزید کچھ کہنا مناسب ہی نہ سمجھا اور سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دل سے بے اختیار دعائیں نکل رہی تھیں کہ عابدہ کا پتہ نہ چلے اور اس بھید پر اس وقت تک پردہ ہی پڑا رہے جب تک اس کے پاؤں اتنے مضبوط نہ ہو جائیں کہ وہ میاں جی جیسے خبیث لوگوں کی دسترس سے بچی رہے۔

جی تو یہی چاہتا تھا کہ اڑ کر اپنی خوش قسمت بہن تک پہنچ جاؤں لیکن مصلحت خاموش رہنے، دیکھنے اور انتظار کرنے میں تھی۔ میں نے فی الوقت اس کو بھلا دینا ہی بہتر سمجھا اور اپنی ڈائری سے وہ ایڈریس ہی نکال کر ضائع کر دیا لیکن میرے ذہن سے کوئی کھرچ کھرچ کر بھی اسے نکال نہ پاتا۔ میں بہت محتاط ہو گئی تھی اور اپنی کسی غیر شعوری حرکت سے بھی انہیں خود پر شک آنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ مجھے خود پر اتنا اعتماد ضرور تھا کہ میں میاں کی شیطانی چالوں کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔

☆☆☆

رات کو ماں میرے کمرے میں آئی اور بڑی ہوشیاری سے مجھے سمجھانے لگی کہ ماں باپ آخر ماں باپ ہی ہوتے ہیں۔ وہ اولاد کی نظروں میں لاکھ بُرے سہی، لیکن ان کے دشمن نہیں بن سکتے۔ عابدہ نے یہ بہت برا کیا۔ اگر اس نے کوئی غلط قدم اٹھا ہی لیا ہے تو

HBC
urdufans.com

اسے چاہئے ماں باپ کو اب بھی کم از کم اعتماد میں تو لے۔ وہ اس کے دشمن نہیں ہیں۔

''بیٹی! مجھے اللہ پاک کی قسم ہے اگر وہ اب بھی مجھے مل جائے تو میں سات ہاتھوں سے اسے قبول کر لوں۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے اگر کوئی غلطی بھی کر لی ہے تو خوش تو ہے۔ کہیں خدانخواستہ اس کے ساتھ معاملہ زبردستی والا نہ ہو۔ وہ اپنے گھر میں خوش رہے۔ ساری زندگی ہم سے نہ ملے لیکن ہمیں علم تو ہو کہ ہماری بیٹی ہے کہاں۔''

یہ کہہ کر اس نے باقاعدہ ٹسوے بہانے شروع کر دیئے۔

میں امی کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور بڑی ہشیاری سے ان کی ہر بات کی تان ہیر پھیر کر اسی ایک فقرے پر لے آتی۔

''اب روتی کیوں ہو ماں! وہ تو تمہاری چہیتی تھی۔ تمہاری دشمن تو میں ہوں۔ دیکھ لئے اپنی لاڈلی کے لچھن۔''

کیا مجال جو میں نے اسے اس معاملے کی ہوا بھی لگنے دی ہو۔ رات کافی دیر گئے تک میرا دماغ چاٹنے کے بعد بالآخر وہ بے نیل و مرام واپس لوٹ گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور لمبی تان کر سو رہی۔

صبح اٹھ کر میں نے ناشتہ کیا اور ہوسٹل چلی آئی۔ سب سے پہلے میں نے عابدہ کو خط لکھ کر اسے نئی زندگی کی مبارکباد اور دعائیں دیں اور پھر حالات لکھ کر اسے یہ بھی بتا دیا کہ گھر والوں کو مجھ پر شک ہے اور وہ لوگ میری نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر میں کہیں آگے پیچھے ہوئی تو قیامت آ جائے گی۔ میں نے اسے کہا تھا۔

''بنو! تمہارا فیصلہ غلط ہے یا صحیح۔ یہ کبھی نہ سوچنا۔ اب صرف اس پر جمے رہنا۔ اس گھر سے تمہاری لاش ہی باہر نکلے ورنہ زندہ درگور ہو کر رہ جاؤ گی۔ اگر اب تم واپس آ گئی تو ساری زندگی فاحشہ بن کر گزارو گی۔''

میں نے اسے آخر میں لکھا تھا'' میرے خط کا جواب ہرگز نہ دینا۔ نہ ہی مجھ سے کسی بھی طرح کا رابطہ قائم کرنا۔ میرے اگلے خط کا انتظار کرنا۔ اس میں باقی تفصیلاً لکھوں گی۔ میں تمہاری کامیاب زندگی کے لئے دعائیں کرتی رہوں گی۔''

میرے معمولات میں بالکل فرق نہ آیا۔ نہ ہی میں نے اپنی کسی شعوری یا غیر شعوری حرکت سے یہ ظاہر ہونے دیا کہ میرے ساتھ کوئی غیر معمولی حادثہ گزر گیا ہے۔ جو طریق واردات وہ لوگ میری نگرانی کے لئے اپنانے والے تھے اس کی سن گن میں نے لے لی تھی اور خاصی محتاط بھی ہو رہی تھی لیکن ضرورت سے زیادہ محتاط رویہ بھی میں نے نہیں اپنایا تھا تاکہ خواہ مخواہ کسی کو میرے متعلق سوچنے یا کوئی غلط رائے قائم کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی رات کے کسی پہر دن کو کسی گوشہ تنہائی میں اچانک آصف ایک سوال بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوتا۔

''بتاؤ نجمہ۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں خود کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو؟''

اُس کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا تھا۔

اور میں بے بسی سے صرف رو دیتی کہ رونے کے علاوہ اور کسی بات پر میرا اختیار نہیں تھا۔ فرزانہ نے میری طرف سے بالکل مایوس ہو کر مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن ایک روز اچانک اس کا خط آ گیا۔

''باجی!

جی تو نہیں چاہتا کہ آپ جیسی بے وفا اور دغاباز لڑکی کو مخاطب کروں لیکن کیا کروں۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے اور وہ بھی جی جان سے پیارا۔ امریکہ جانے سے پہلے آصف نے مجھے کہا تھا۔''فرزانہ میری امانت کا خیال رکھنا۔''

سوچتی ہوں اب وہ دو ماہ کے بعد جب انجینئر بن کر پاکستان لوٹ رہا ہے تو اسے کیا منہ دکھاؤں گی۔

playing at the ... level in bid to extend his inter-
national career.

urdufanz.com

کاش اس نے آپ کو سمجھنے میں اتنی شدید غلطی نہ کی ہوتی۔"

تو آصف واپس آ ہی گیا۔

"اب بتاؤ کہاں جاؤ گی بھاگ کر؟"

آصف کا سامنا کر پاؤ گی۔ اپنے ساتھ کیا عہد نبھا سکو گی یا ساری زندگی اسے احساس محرومی کا شکار بنا کر اس سے چمٹی رہو گی اور وہ بیچارہ محض اس لئے تمہیں اپنے ساتھ لگائے رکھے کہ "اس نے تمہیں اپنانے کا وعدہ کیا تھا۔" نہیں نجمہ بی نہیں۔ تمہارا منصب یہ نہیں کہ اپنے محبوب کو جیتے جی مار ڈالو۔ تم اس کی دلہن بننے کے قابل نہیں ہو نجمہ! اس کی شریک حیات بننے کا حق اس جیسی کسی لائق فائق لڑکی کو ہے۔ تم بیچاری ایک معمولی سی نرس آصف کے قابل ہرگز نہیں ہو۔"

میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا۔

اف میرے خدا پھر میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟

اس سوال کا جواب میرے سامنے رکھے اخبار میں موجود تھا۔

"غیر ممالک کے لئے نرسوں کی ضرورت" کے عنوان سے ایک اشتہار موجود تھا جس میں لکھی تمام شرائط پر میں پوری اترتی تھی۔ اب عابدہ نے بھی اپنا گھر بسا لیا تھا اور جلد یا بدیر اس کی طرف سے مایوس ہو کر بہر حال میرے والدین اور ان کی چنڈال چوکڑی کی للچاتی ہوئی نظریں میری طرف ہی اٹھتیں۔ میں کوئی جوڈو کراٹے کی چیمپئن تو تھی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو کب تک میاں جیسے شیطانوں کا مقابلہ کر پاتی۔؟

پھر امی بھی تو کب سے کہہ رہی تھی یہ سب کچھ۔ ان کو بھی تو غیر ملکی فریج، ٹی وی، وی سی آر، کپڑے درکار تھے۔ ان کو اعتماد میں لیکر یہاں سے نکل جاؤ نجمہ! کہ یہی فلاح کا راستہ ہے۔ ... آپ کی مرضی بھی پوری ہو جائے گی اور آصف کا سامنا کرنے سے بھی بچ

جاؤ گی۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں نے اس کمپنی کو درخواست بھیجی تھی۔

☆☆☆

درخواست کے ساتھ اپنی "تازہ تصویر" کی شرط بھی لکھی تھی۔ شاید "میری تصویر" ہی کا کرشمہ تھا کہ مجھے درخواست بھیجنے کے چار پانچ روز کے بعد کمپنی کی طرف سے "انٹرویو کال" آ گئی۔ جب اماں کو میں نے یہ مژدہ جانفزا سنایا تو بلی کے بھاگوں جیسے چھینکا ٹوٹا۔ وہ تو مارے خوشی کے اچھل پڑیں۔

میرے ساتھ میرے ہسپتال کی کئی اور نرسوں نے بھی درخواستیں دی تھیں اور اب وہ سب ایک دوسری سے خوامخواہ حسد کرنے لگی تھیں۔

انٹرویو والے دن میری ماں نے مجھے خاص طور سے اپنی نگرانی میں نہ صرف تیار کروایا بلکہ میک اپ کرنے کا حکم بھی ملا۔ جب میں بن سنور کر شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تو زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس ہوا۔ میں نے خود پر دھیان ہی دینا چھوڑ دیا تھا۔

میری ماں مجھ سے زیادہ بنی سنوری میرے ساتھ ہی گئی تھی۔ جب ہم اس دفتر میں پہنچے تو میری ماں کی آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے ہم کسی یورپی ملک میں آ گئے ہوں۔ ایک خوبصورت اور نازک اندام سیکرٹری نے ہماری رہنمائی ایک ائرکنڈیشنڈ کمرے کی طرف کی جہاں ایک میز پر تین مختلف رنگ کے ٹیلیفون رکھے تھے اور جس کی سجاوٹ میں بلا مبالغہ ہزاروں روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹی وہاں بیٹھ گئیں۔ کرسی پر کوئی نہیں تھا۔

اتنے میں ہمارے پیچھے دروازہ کھلا اور ایک انتہائی قیمتی سوٹ میں ملبوس سمارٹ نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی شخصیت کچھ اتنی پُر فریب تھی کہ میں بھی اپنی ماں کے ساتھ اٹھ

کھڑی ہوگئی۔

"بیٹھیے بیٹھیے تشریف رکھیے۔"

اُس نے اپنے ہونٹوں پر دلفریب اور کاروباری مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کہا اور ہم ماں بیٹی کسی میکانکی عمل کے تحت بیٹھ گئیں۔

"آپ کی تعریف؟"

نظروں ہی نظروں میں میری قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جی یہ میری بیٹی نجمہ ہے"۔

میری بجائے میری ماں نے بڑی انکساری سے کہا۔

"کیا فرمایا۔ آپ کی بیٹی! معاف کیجئے میں تو آپ کو ان کی بڑی بہن سمجھ رہا تھا"......

اس نے عورت کی دُکھی رگ پر ہاتھ رکھا اور ایک ہی فقرے میں میری ماں کو لوٹ لیا۔

اس اثناء میں ایک باوردی ملازم ہمارے لئے چائے لے کر آ گیا۔ زندگی میں اتنے شاندار اور قیمتی برتنوں میں شاید ہم نے پہلی مرتبہ چائے پی تھی۔ میری ماں تو کیا، میں بھی اب آہستہ آہستہ اس کے طلسم میں پھنستی اور اس سے مرعوب ہوتی جا رہی تھی۔ بڑا کامیاب کھلاڑی تھا وہ۔ اپنے دھندے کے سارے داؤ پیچ جانتا تھا۔ چائے پینے کے دوران میں کم از کم پانچ چھ مرتبہ مختلف فونوں کی گھنٹیاں بجی تھیں اور ہر مرتبہ وہ نوجوان یہی کہتا تھا کہ ابھی ان کے پاس جگہ نہیں ہے۔

"نجانے کیسے بے وقوف لوگ ہیں۔ اب ہم نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر ایک کو باہر لے جانے کا"

HBO
urdufans.com

اس نے آخری فون سن کر میری ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور میری ماں نے اس کے جواب میں فوراً سر ہلا دیا۔ اس کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ تو نجانے کب سے میرے لئے ایسی نوکری کے خواب دیکھ رہی تھی۔ یہاں تو "بونس" میں کچھ اور بھی اس کے لئے موجود تھا

"معاف کیجئے آپ ذرا تشریف رکھیں میں مس نجمہ کو انٹرویو کے لئے لے جاؤں"......

اس نے میری ماں سے بڑے مؤدب لہجے میں اجازت طلب کی۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں؟"

میری ماں کی تو مراد بر آئی تھی۔

میں اس کے اشارے پر سحرزدہ سی اٹھ کر چل دی۔

دوسرا کمرہ بھی اس سے ملتا جلتا تھا اور انٹرویو لینے والا ابھی وہی تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ آخر اس نے میری ماں سے علیحدہ ہونا ہی کیوں ضروری سمجھا تھا۔ کتنی ناسمجھ تھی تب میں!

"معاف کیجئے کیا آپ کی امی بھی باہر جائیں گی؟"

اس نے مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک قیمتی سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"جی نہیں"۔

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"بُرا نہ مانیئے میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ جو آئی ہیں"

وہ مسکراتا ہوا میرے سامنے ہی ایک شاندار صوفے پر بیٹھ گیا۔

HBC
urdufans.com

"جی نہیں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔"

میں نے نجانے کیوں یہ فقرہ کہہ کر اس کی غلط فہمی میں مزید اضافہ کر دیا۔ نفسیاتی طور پر میں اس سے مرعوب ہو چکی تھی۔

انٹرویو کے دوران اس نے سوائے مجھ سے "فری" ہونے کی کوشش کے اور کچھ نہ کیا۔ ایک بھی سوال اس نے نرسنگ سے متعلق نہ پوچھا۔ اس کے سوالات پوچھنے کا انداز اتنا بے ہودہ تھا کہ اچھے بھلے آدمی کو غصہ آ جائے لیکن میں نجانے کیوں چپ رہی۔ شاید میں نے حالات سے "کمپرومائز" کر لیا تھا۔

آدھ گھنٹے تک ہم دونوں گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہ میرے ساتھ ہی اسی کمرے میں آ گیا جہاں میری ماں بیٹھی بے چینی سے نتیجے کی منتظر تھی۔

"آپ بے فکر رہیئے آنٹی! نجانے مجھے آپ لوگوں سے کیوں اُنس سا ہو گیا ہے۔ آپ کے قریب ہی میرے ایک رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ میں اس طرف سے گزرتا رہتا ہوں۔ جلد ہی ہم آپ کو نتیجے سے مطلع کر دیں گے۔"

"بیٹے ہمارے ہاں بھی ضرور آنا۔"

بالآخر میری ماں اس کے جال میں مکمل پھنس گئی۔ شاید وہ میری ماں سے بھی زیادہ شاطر تھا۔

اور پانچویں روز ہی "بیٹا" ہمارے گھر آ گیا۔

میں اس وقت گھر نہیں ہسپتال ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ اس فرم کا منیجر ہے۔ باقی لوگ تو نہیں مانتے لیکن وہ کچھ بھی ہو جائے نجمہ کو ضرور ہی باہر بھیجے گا۔

اس نے میری ماں پر چکنی چپڑی باتوں سے جادو ہی تو کر دیا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ ہوس نے ان کی آنکھوں پر پٹی جو باندھ رکھی تھی۔ وہ تو ساون کے اندھے بن چکے تھے جنہیں

سوائے ہریالی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں تو پیسہ چاہئے تھا۔ کیا ہوا اگر بیٹی اپنے ملک میں ان کے کام نہ آ سکی...... اب جو ان کی لاٹری نکل رہی تھی تو وہ خوش کیوں نہ ہوتے۔

میری ماں بضد تھی کہ وہ اپنی "لاکھ مصروفیت" کے باوجود نجمہ سے مل کر ہی جائے۔ ماں نے مجھے ہسپتال فون کر کے فوراً گھر آنے کو کہا۔

جب میں گھر پہنچی تو میرے والدین اس کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میری والدہ کھل اٹھی۔

"لو بھئی اب تم لوگ بیٹھو۔ مجھے تو گھر کا کام بھی کرنا ہے۔"

وہ بہانہ بنا کر اُٹھ گئی۔

اب میں اور وہ اکیلے ہی وہاں موجود تھے۔ میری ماں مجھے برباد کرنے پر تل گئی تھی یا میں خود برباد ہونے پر...... اس سوال کا جواب مجھے آج تک نہیں مل سکا۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہوا اس عمل کو وقوع پذیر ہو کر ہی رہنا تھا۔

تنہائی میسر آتے ہی "امی کے بیٹے" نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔

"میرا نام پرویز ہے"......

اس نے غنیمت لمحوں کا احساس کیا...... "اور مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ابھی تک میرا نام بھی دریافت نہیں کیا؟" اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں خاموش رہی کیونکہ میرا ذہن کہیں اور تھا۔ کسی اور کے پاس۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ آصف کے سوا کوئی اور نوجوان اس طرح تخلیے میں مجھ سے مخاطب ہو گا۔ ماں بظاہر یہی سمجھ رہی تھی کہ اس نے بالآخر اور اچانک بازی جیت لی ہے لیکن یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میں جان بوجھ کر ہارنے پر تل گئی ہوں اور جب کوئی خود ہی برباد ہونے پر تل جائے تو بربادی کو کون روک سکتا ہے۔

"آپ شاید سوچ رہی ہیں کہ میں کوئی عام سا نوجوان ہوں اور آپ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا کر آپ پر ڈورے ڈالنے کی فکر میں ہوں۔"

اس نے میرا عندیہ بھی بھانپ لیا اور مجھ پر ایک اور نفسیاتی وار کر دیا۔

"نہیں۔ پرویز صاحب!" میں نے بڑی لمبی سانس لی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"مس نجمہ!" اس نے دوبارہ سٹارٹ لیا...... "میرا تعلق جس فرم سے ہے وہاں مجھے ہر دوسرے تیسرے روز دنیا بھر کی درجنوں خوبصورت عورتوں سے پالا پڑتا ہے۔ مجھے کسی شے کی کمی نہیں مس نجمہ!...... اگر خدانخواستہ میرا ایسا ہی کوئی غلط ارادہ ہوتو آپ ہی سوچئے آخر مجھے رکاوٹ کس بات کی؟" اس نے بات ختم کر کے پھر میری طرف بڑی ملتجی نظروں سے دیکھا۔

جواب میں میری خاموشی کو اس نے دوبارہ شاید "نیم رضامندی" سے تعبیر کیا ہوگا اور مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس کی دلیل بڑی مضبوط تھی اگر وہ اس میدان کا کھلاڑی ہی تھا تو اسے کمی کیا تھی۔ پھر مجھ میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے تھے۔

"شاید آپ کو میرے خلوص پر ابھی یقین نہ آئے لیکن اس خدشے کے باوجود کہ آپ بُرا مان جائیں گے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ آپ کی سادگی نے مجھے لوٹ لیا ہے......"

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"مس نجمہ! میں نے اس کم عمری میں بڑا تجربہ حاصل کیا ہے۔ یقین مانئے آج تک ایسے کھوکھلے چہروں ہی سے پڑا۔ جس روز سے آپ سے ملا ہوں نجانے کیوں مجھے احساس ہونے لگا ہے جیسے میری کوئی برسوں سے کھوئی ہوئی انتہائی قیمتی شے مجھے واپس مل گئی ہے۔"

HBC
urdufans.com

اس کا لہجہ خاصا جذباتی ہونے لگا تھا۔ اتنا جذباتی کہ مجھے اس کی ایکٹنگ اصلیت نظر آنے لگی۔

میری نفسیاتی کیفیت بڑی عجیب وغریب سی ہو رہی تھی۔ آصف سے علیحدگی کے بعد میں جس "روحانی یتیم پن" کا شکار ہوئی تھی اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کئی دفعہ تو مجھے بے اختیار خود پر رحم آنے لگتا تھا۔ جب پرویز مجھ سے باتیں کر رہا تھا تو میرے احساسات بڑے عجیب وغریب تھے۔ مجھے اس کی باتوں سے اگر دلچسپی نہیں تھی تو وہ کم از کم بُری بھی نہیں لگ رہی تھیں۔

اور وہ...... ایسی باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھے اپنی محرومیوں کی ایسی دردبھری داستان سنائی کہ میرا دل بھر آیا۔

"ماں بچپن میں مرگئی۔ باپ نے بیاہ رچا لیا۔ سوتیلی ماں نے دونوں بہن بھائیوں کو دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ ایک رشتہ دار نے خدا خوفی کر کے سہارا دیا اور اب جب وہ کسی قابل ہوئے ہیں تو سارا خاندان اس کے لئے رشتے لئے پھر رہا ہے کیونکہ اس نے اپنی بہن کو سونے میں تول کر بیاہا ہے"...... یہ اور ایسی بے شمار باتیں۔

"مس نجمہ! شاید آپ مجھے اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھیں کہ ایف۔ اے کرتے ہی مجھے ایسی شاندار فرم مل گئی جس نے میری ہزاروں روپے تنخواہ ہی مقرر نہیں کر رکھی بلکہ ہزاروں روپے ماہوار میرے الاؤنس بھی بن جاتے ہیں لیکن زندگی میں بہت بڑا خلا رہ گیا ہے۔ جانے یہ خلا کب پُر ہوگا...... کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے میری قسمت میں محبت کا خانہ ہی نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے باقاعدہ اس کے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔

مجھے یہ شخص اپنے جیسا لگا۔ بکھرا ہوا اور نامکمل انسان۔

HEC
urdufans.com

عجیب حسن اتفاق تھا۔ مجھے ملا بھی تو اپنے ہی جیسا۔ اس لمحے میں نے یہی سوچا کہ قدرت کو شاید میری ''قربانی'' پسند آگئی ہے اور اس نے پرویز کی شکل میں میرے لئے آصف کا نعم البدل پیدا کر دیا ہے۔ مجھے محبت ملی اور چھن گئی تھی اور وہ ابھی تک سچی محبت کا متلاشی تھا۔ جب انسان کسی بات کو قبولنے پر آجائے کوئی نظریۂ خواہ وہ دوسروں کی نظر میں باطل ہی کیوں نہ ہو، اپنانا چاہے تو اس کے لئے دلائل بھی خود ہی اپنے مطلب کے مطابق تراش لیتا ہے۔ اس لمحے میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اگر اس کا مقصود کوئی ''غلط حرکت کا ارتکاب'' ہی ہے، تو واقعی جس فرم میں اور جس طرح کا کام وہ کرتا تھا اس کے لئے کسی شے کی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر فخر کر سکتی تھی۔ خود میری ہی بہت سی ایسی واقف کار تھیں جو مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں اور باہر جانے کی کوئی بھی قیمت بخوشی ادا کر سکتی تھیں۔ آخر وہ مجھ میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے تو ضرور کسی بات سے متاثر ہو گیا ہو گا...... شاید قدرت نے مجھے پرویز کی صورت نوازنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ شاید اسے ہماری اصلیت کا اندازہ ہو گیا ہو اور وہ مجھے اس گناہوں کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہو۔

پرویز سے میں نے کچھ نہ کہا لیکن میرا مثبت رویہ اسے میرا مدعا سمجھانے کے لئے کافی تھا۔ یوں بھی وہ خاصا سمجھدار شکاری تھا اور شکار کو خاصا بھگا کر مارنے کا عادی۔ اس نے تیسرے چوتھے ہی روز مجھے فون کر دیا۔ خدا جانے اس نے ہوسٹل اور میرے کمرے کا نمبر کہاں سے لیا تھا۔ شاید ای سے!

مجھے آج تک ہوسٹل میں کسی مرد کا فون نہیں آیا تھا۔ جو لڑکی میرے کمرے تک فون کی اطلاع دینے آئی تھی، اس نے مجھے بڑی ہی عجیب سی نظروں سے دیکھا اور قدرے مسکرا کر یہ اطلاع مجھ تک پہنچائی کہ کوئی پرویز صاحب مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ میں گڑبڑا کر

اٹھی اور فون تک پہنچی۔

''برا تو نہیں مانا آپ نے''......

اس نے میری ''ہیلو'' سنتے ہی پوچھ لیا۔

''جی نہیں''......

میں اور کیا کہتی۔

''دراصل مس نجمہ! میں آپ کو ایک بہت بڑی خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ آپ ایسا کیجئے۔ آج پانچ بجے شام ہوٹل شیراز پر آجایئے۔ میں دروازے کے باہر ہی آپ کا انتظار کروں گا۔''

میری گھبراہٹ سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

''جی میں میں......''

میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''بس اب کچھ اور نہ کہیے پلیز!''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولا۔ ''میں نے ابھی سے آپ کا انتظار شروع کر دیا ہے۔ اچھا خدا حافظ''...... سلسلہ کٹ گیا۔

پانچ بجے تک میرے اندر یہی کشمکش لگی رہی کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ بالآخر مجھے جانا ہی پڑا۔ میں آدھا گھنٹہ دیر سے پہنچی تھی اور وہ جانے کب سے میرا وہاں منتظر تھا۔ جبکہ مجھے یہی اُمید تھی کہ وہ جا چکا ہو گا۔

''شیراز'' ہمارے شہر کے ان ہوٹلوں میں سے ایک تھا جس تک مجھ ایسوں کی رسائی کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اشارے سے مجھے اپنی قیمتی کار بھی دکھا دی تھی۔ وہ ہوٹل کی مین انٹرنس پر کھڑا میرا منتظر تھا۔

HBC
urdufans.com

اس لمحے میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات سمائی تھی کہ آصف کے لئے دی گئی میری قربانی اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی ہے اور اس نے پرویز کی شکل میں مجھے انعام سے نوازا ہے۔ کتنی بھولی تھی میں۔

شاید اس ہوٹل کے بیرے پرویز کو پہلے سے جانتے تھے کیونکہ جہاں جہاں سے وہ گزرتا وہ مؤدب کھڑے ہو کر اسے سلام کرتے تھے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ پرویز کوئی بہت ہی غیر معمولی شخصیت کا حامل ہے اور میرے تصورات سے بھی بڑا آدمی۔ اس رات اس شاندار ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ہم دونوں نے ہمیشہ کے لئے ایک ساتھ جینے مرنے کا عہد کر لیا۔ اس نے مجھ سے نوکری چھوڑ دینے کو کہا۔

"کیوں؟"......

میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

"محترمہ! میں نے یہی خوشخبری سنانے کے لئے تو آپ کو یہاں زحمت دی ہے کہ میری کمپنی نے آپ کا انتخاب کر لیا ہے۔ باضابطہ اطلاع بھی آپ کو جلدی مل جائے گی۔"

"آپ کا شکریہ لیکن "باضابطہ اطلاع" سے پہلے شاید میرے لئے یہ ممکن نہ ہو۔"

میرا لہجہ گو کہ غیر سنجیدہ تھا لیکن پرویز کچھ اداس سا ہو گیا۔

ٹھیک ہے جناب "باضابطہ اطلاع" بھی پیش کر دیں گے۔

اس نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہا کہ میں شرم سے دوہری ہو گئی۔

واپسی پر وہ مجھے اسی کار میں چھوڑنے ہوسٹل تک آیا۔ اس نے میرے روکتے روکتے بھی کار ہوسٹل کے دروازے کے سامنے لا کر کھڑی کی تھی۔ گو کہ یہاں ایسی کاروں کا آنا جانا رہتا تھا لیکن مجھ ایسی نرس کو "ایسی کار" سے اترتے دیکھ کر گیٹ پر موجود چوکیدار کا

چونک پڑنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اونچی آواز میں "بی بی سلام علیکم" کہہ کر اس کا احساس بھی دلا دیا تھا۔

☆☆☆

صبح میں نے چھٹی کی درخواست گزاری اور اس موقع کو غنیمت جان کر عابدہ سے ملنے چلی گئی۔ خدا جانے پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے۔

عابدہ کے گھر میں دو گھنٹے کے بعد ہی پہنچ گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر جس شخصیت نے پٹ کھولے اسے دیکھتے ہی مجھے میری دادی یاد آ گئی۔ ایک وقار اور تقدس اس بوڑھی عورت کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔

"مجھے عابدہ سے ملنا ہے۔"

میں نے سلام کر کے اسے کہا۔

"آؤ بیٹی آؤ! میں تو تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم نجمہ ہو۔ کتنے دنوں سے بے چاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ مکان گو کہ چھوٹا تھا لیکن اس امر کا منہ بولتا ثبوت کہ اس کے مکین بڑے ظرف اور دل کے مالک ہیں۔ مجھے ایک سادگی سے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس تقدس مآب ہستی نے عابدہ کو آواز دی جو شاید ابھی تک میری آمد سے بے خبر تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اچانک خوشی اور حیرت سے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ پھر بے اختیار اس کی باہیں پھیل گئیں۔

"باجی!" وہ مسرت بھرے رندھے ہوئے گلے سے چلائی اور میرے کلیجے میں سما

HBC
urduians.com

گئی۔

''آپ نے کتنی دیر کر دی باجی! آپ نے...... آپ نے......''

بے ربط سے جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اس کی جذباتی کیفیت اور موقعے کی مناسبت سے بزرگ خاتون نے ہمیں اکیلے چھوڑ دینے ہی میں مصلحت جانی۔

''اچھا بیٹا! میں ذرا اشفاق کو اطلاع کرواتی ہوں۔'' کہہ کر وہ چلی گئیں۔

دو تین منٹ تک تو ہم دونوں نے سوائے رونے کے اور کچھ نہ کیا۔ پھر مجھے ہی ہوش آیا۔ میں نے اسے ''نئی زندگی'' کی مبارکباد دیکر اس کی خوش بختی پر نعرہ تحسین الاپا۔ اسے اچھے مستقبل کی دعائیں دیں اور اپنے دیر سے آنے کی وضاحت بھی کر دی اور اس کے بعد گھر میں آنے والی قیامت کی بھی خبر دے دی۔

''مجھے کسی کا ڈر نہیں باجی! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا...... بس یونہی ابھی بطور احتیاط امی سے نہیں مل رہی۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ ورنہ ''ان'' کی طرف سے تو مجھے ملنے کی پوری پوری اجازت ہے''

اس کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اس کا ''ان'' بھی آ گیا۔

''سلام علیکم باجی! اشفاق نام ہے میرا۔''

ایک دراز قد کھلتے ہوئے رنگ اور تیکھے نقوش والے نوجوان نے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی خاندانی شرافت اس کے لفظوں اور چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ واقعی عابدہ خوش قسمت تھی اور اس کا انتخاب شاندار......

''عابدہ نے میرا تعارف تو کروا دیا ہوگا۔ لیکن میں نے پھر بھی یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی سب کچھ کہہ دوں''......

اس نے ہمارے چہروں سے ماحول کی سنجیدگی کا اندازہ لگاتے ہوئے بظاہر اس

کے عین سنجیدگی سے نجات کی راہ اپنائی۔ دو قدم آگے بڑھ کر وہ جھک گیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ابھی بمشکل ایک دو دعائیہ کلمات ہی کہے تھے کہ دل بھر آیا اور میں بے اختیار سسک پڑی۔

''ارے واہ! بھئی یہ خوش ہونے کا کونسا طریقہ ہے''......

اس نے پھر موقعہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

''خوشی کے آنسو ہیں بھائی! اللہ تم دونوں کو نظر بد سے بچائے''......

بالآخر میں نے خود پر قابو پالیا۔

اشفاق میں عام نوجوانوں والی کوئی بھی بات مجھے نظر نہ آئی۔ اس کی عمر جتنی کم تھی گفتگو اتنی ہی سنجیدہ۔ اس نے مجھے ایک ہی بات کہی کہ عابدہ کے ساتھ اس کی شادی کوئی جذباتی فیصلہ نہیں۔ اس نے سوچ سمجھ کر حالات کا جائزہ لیکر اور اپنے والدین کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہے۔

خود عابدہ جتنی مطمئن تھی اور اس کے چہرے سے جس طمانیت اور سکون کا احساس ہو رہا تھا اس کے بعد تو کوئی وجہ ہی نہ رہ جاتی تھی کہ میں اس کی ازدواجی زندگی کے متعلق پریشان ہوتی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اب عابدہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

اشفاق کے والدین نے بھی مجھے مطمئن کر دیا۔ میں اپنی بہن کے لئے کچھ تحائف لے گئی تھی وہ اس کی نذر کر دیئے۔ پھر اسے اپنے باہر جانے کی اطلاع بھی دے دی۔ اس خبر نے عابدہ کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔

''باجی! اپنوں میں ایک آپ ہی تو تھیں جن سے مل سکتی ہوں۔ اب آپ بھی چلی جائیں گی تو میں......''

وہ ایک ٹھنڈی سانس لیکر چپ ہو گئی۔

HEC
urdufans.com

شام کو ہم دونوں بہنیں جدا ہو گئیں۔ میرے نا نا کرنے کے باوجود اشتاق مجھے بس اڈے تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے روانگی کے وقت پھر مجھ سے کہا تھا۔

"باجی! اپنے دل پر کوئی بوجھ لے کر نہ جانا۔ مجھے عابدہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر زندگی میں کبھی میرے ہوتے ہوئے آپ کو بھائی کی کمی کا احساس ہوا تو میں خود کو معاف نہیں کرسکوں گا"۔

میں خاموش رہی۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا اعتماد تھا کہ اس کی ہر بات سچ معلوم پڑتی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ نوجوان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ضرور کر کے دکھا دے گا۔ میں نے اسے دعائیں دے کر رخصت کیا اور کہا کہ وہ جب بھی چاہے پورے اعتماد کے ساتھ ہمارے گاؤں میں تایا جی سے رابطہ کر سکتا ہے جو ابھی تک ہمارے لئے بہر حال ایک اچھی اُمید تھے۔ اشتاق نے مجھے کہا

"باجی جب عابدہ کا جی چاہے گا۔ جس سے ملنے کو چاہے گا۔ وہ اس سے ضرور ملے گی۔ میں خوفزدہ نہیں۔ نہ ہی مجھے آپکی امی یا میاں جی سے کچھ لینا دینا ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج میں بخوبی کر سکتا ہوں۔ اگر خاموش ہوں تو صرف اس لئے کہ عابدہ ایسا چاہتی ہے۔ اور میں اُس سے محبت ہی نہیں اُس کی عزت بھی کرتا ہوں۔"

مجھے اس کی باتوں سے بہت حوصلہ ہوا۔

☆☆☆

ملاقات کے تیسرے ہی روز فرم کی طرف سے دس ہزار روپے کا ڈرافٹ اور ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "مجھے منتخب کر لیا گیا ہے اور اب مجھے تین مہینے کراچی میں "خصوصی ٹریننگ" دینے کے بعد باہر بھیجا جائے گا۔ اس اثناء میں میرے والدین کو تین ہزار روپے مہینہ بھی ملتا رہے گا اور ٹریننگ کے اخراجات میری کمپنی برداشت کرے گی۔ یہ ابتدائی

اخراجات تیاری کے لئے دیئے گئے ہیں۔

میری ماں کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ تو پرویز پر مٹے جا رہی تھی۔ شام کو پرویز خود چلا آیا۔ اس نے آتے ہی مجھے مبارکباد دی۔ اس نے میری ماں کے سامنے ہی مجھے دو شاندار ساڑھیاں تحفہ دیں۔ میری ماں نے اس بات کو بھی اپنی خوش قسمتی جانا کہ اتنا بڑا آدمی میرا "عاشق" ہے۔ حالانکہ میری ماں جانتی تھی مجھے تو ڈھنگ سے ساڑھی باندھنی بھی نہیں آتی اور نہ ہی میں نے کبھی باندھی تھی۔

کچھ لوگ زندگی بھر تجربے کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کی زندگیاں تجربات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ میرا شمار دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ پیدائش سے اب تک زندگی نے مجھے جی بھر کر آزمایا اور ٹھوک بجا کر پرکھا ہے۔ نجانے مجھ میں سے اسے کیا حاصل کرنا تھا۔ آصف سے محبت کے جس تلخ تجربے سے میں گزری تھی اور خود کو تج کر جس طرح اس کا خراج ادا کر رہی تھی اس کے بعد بظاہر یہ ناممکن تھا کہ میں دوبارہ اس وادی پرخار میں اتروں گی اور وہ بھی اس حالت میں کہ میرے تلوؤں سے لہو رس رہا ہو گا۔

لیکن......!

آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خلا، جو بچپن ہی سے میری زندگی میں پیدا ہو چکا تھا اسے چونکہ محبت ہی سے پُر ہونا تھا لہٰذا ہر جگہ میں نے اس محبت کے نام پر ہی فریب کھایا اور کبھی خود کو فریب دیا۔ میری حالت اس وقت تک اس ننھے بچے کی سی تھی جو ہر چمکتی شے کو سونا سمجھ کر اس کی طرف لپکے اور اپنے ہاتھ جلا بیٹھے۔

پرویز سے ملنے کے بعد میں نے آصف کو بھلایا نہیں تھا۔ جو لوگ زندگی کا حصہ بن جائیں وہ خود سے لاکھ جھٹکنے کے بعد بھی الگ نہیں کئے جا سکتے۔ بس اتنا ہوا کہ میرے اندر دہکتے ہوئے الاؤ پر ایک دفعہ تو منوں ریت گر پڑی جس نے ان شعلوں کو جو مجھے بھسم

urdufans.com

کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کسی حد تک اس ریت تلے دبا دیا۔ لیکن اس طرح دل کے اندر
دہکتا آتش نشاں کبھی ٹھنڈا بھی ہوا ہے کیا؟

پرویز سے ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ اس کی جگہ اگر اور بھی کوئی اس جیسا نوجوان ہوتا
تو ضرور اسے میرے والدین کی آشیرواد حاصل ہو جاتی۔ اس کی تو بات ہی اور تھی۔ میری
ماں کو تو اس کی آمد کا انتظار رہتا تھا۔

عابدہ کے تجربے سے میں نے یہی سیکھا تھا کہ عورت اکیلی زندگی کی لڑائی نہیں لڑ
سکتی۔ اسے بہرحال ایک مضبوط سہارے کی تلاش رہتی ہے۔ اشتاق کی شکل میں اسے ایک
سائبان میسر آگیا تھا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ حالات کی کڑی اور جان توڑ دھوپ سے محفوظ
رہ سکتی تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا اور مجھے اپنا گھر بنانا تھا..... !

بظاہر تو میں بڑی بہادر بننے نکلی تھی لیکن میری فطرت میں سمائی بزدلی کے سامنے
مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ عابدہ سے ملنے کے بعد میری سوچ نے ایک نیا رُخ اپنانا
شروع کر دیا تھا۔ پرویز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے میرا انتخاب بیوی بنانے کے لئے کیا ہے
اور ہم شادی کے بعد مستقل یورپ میں آباد ہو جائیں گے .. اور میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ
اس طرح میں اپنے والدین کے شر سے اور آصف کا سامنا کرنے سے زندگی بھر کے لئے بچ
جاؤں گی۔

یہی میرا مقصود تھا۔ میں نے زندگی سے بہت کچھ مانگا ہی کب تھا؟ میں نے کبھی
اپنے حصے کی خوشیاں بھی طلب نہیں کی تھیں۔ تقدیر کے ہر فیصلے پر صاد کیا تھا ..... لیکن مجھے کسی
نے نہ بتایا کہ دراصل جسے میں "قربانی" کہہ کر خود کو دھوکو سلا رہی تھی ..... وہ سراب تھا۔
دھوکہ تھا اور یہ دھوکہ کسی اور نے نہیں میں نے خود اپنے ساتھ کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں اپنی قبر
کھودی تھی میں نے

پرویز سے ملاقاتیں اور سیر سپاٹے روزانہ کا معمول تھا۔ ہر نئی ملاقات پر
مستقبل کی ایسی سہانی اور دلفریب تصویر دکھاتا کہ میں اس کی دلدل میں گہری سے گہری
اترتی چلی جاتی۔ نوکری سے میں نے اس کے بلند ہونے پر استعفیٰ دے دیا تھا۔ آج سوچتی
ہوں کہ اس کی وجہ بھی یقیناً یہی ہوگی کہ اس طرح اس کے نزدیک میرے "ارادہ بدلنے" کے
امکانات بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتے۔

پرویز کے دفتر میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس دوران میں نے یہ بات خاص طور
سے محسوس کی کہ اس کے اعلیٰ عہدے یا کسی اور وجہ سے کسی نے میری طرف کبھی غلط نظروں
سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک اس کا اسسٹنٹ نوید ضرور ایسا تھا جو کبھی کبھی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا
رہتا لیکن میری نظروں کا سامنا کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے نوید کے اس رویئے سے
اُلجھن ہونے لگتی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پاتا۔

اس روز بھی جب میں پرویز سے اچانک ملنے پہنچی تو وہ شاید کسی کام سے گیا ہوا
تھا۔ اس کا اسسٹنٹ نوید اس کے کمرے میں ایک فائل پر جھکا ہوا تھا۔

"تشریف رکھیے" .....

آج پہلی مرتبہ اس نے مجھے مخاطب کرنے کی ہمت کی تھی۔ اس کے لہجے میں
نجانے ایسی کیا بات تھی کہ مجھے بے اختیار اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ ایش ٹرے
میں سلگتے سگریٹ کا لمبا کش لے اس نے دھوئیں کے مرغولے بنائے اور مجھ سے مخاطب
ہوا۔

"نجمہ بی بی! مجھے آپ سے بات کرنے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ یوں بھی میں کوئی
بہت اچھا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن پچھلے پندرہ بیس دنوں سے میں جب بھی آپ کو دیکھتا ہوں
ایک نادیدہ طاقت مجھے مجبور کرنے لگتی ہے کہ میں آپ کو حقائق سے ضرور آگاہ کروں
یہ

HBC
urdufans.com

نتے ہوئے بھی کہ مجھے اس ہمدردی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر بڑے اطمینان سے کہا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

میں الجھنے لگی تھی۔

"میں اتنے بُرے انسانوں میں رہتا ہوں مس نجمہ! کہ جہاں اپنی سگی ماں بہن کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن میں آپ کو اپنی بہن سمجھ کر یہ بات بتا رہا ہوں کہ آپ بہت بھولی ہیں۔ آپ ایک گہرے دلدل میں پھنسنے جا رہی ہیں۔ ایک جال آپ کے گرد بُنا جا رہا ہے۔ اس میں سے، اب بھی وقت ہے کہ نکل جایئے۔"

اس کی آواز بڑی دھیمی تھی۔ شاید اسے اس بات کا خوف تھا کہ دیواریں ہی اس کی آواز نہ سن لیں۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھا البتہ محتاط دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھا تو اسی لئے یہ کمبخت مجھے گھور گھور کر دیکھا کرتا تھا۔ اب ایک مقدس رشتے کی آڑ میں میرے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔" میں نے سوچا ... "حاسد" ..... اس کے متعلق ایک ہی لفظ میرے ذہن میں اُبھرا اور میں پھٹ پڑی۔

"بکواس بند کرو... خبردار اگر آئندہ کبھی مجھ سے بات بھی کرنے کی ہمت کی۔"

میں غصے سے کانپتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی۔ وہ خاموشی سے مجھے جاتے دیکھتا رہا۔ ابھی میں نے گیٹ سے پاؤں ہی باہر نکالا تھا کہ پرویز کی گاڑی وہاں اچانک آ کر رکی۔

"نجمہ تم" اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

نہ جانے کیوں نمی سی تیرنے لگی تھی

"کیا بات ہے خیریت تو ہے نا؟"

اس نے گھبرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میرے آنسو نکل پڑے۔ اس سے کچھ کہہ نہ سکی

اس نے بے چینی سے کہا" آؤ آؤ اندر چلتے ہیں"۔

"نہیں پرویز! تمہارے دفتر میں نہیں، کہیں اور چلتے ہیں"

میں نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اچھا بھئی لیکن خدا کے لئے رونا نہ شروع کر دینا۔"

اس نے اگلا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔

ہم دونوں تھوڑی ہی دیر بعد ایک شاندار ہوٹل کے "گوشہ عافیت" میں ایک دوسرے کے سامنے چائے کی پیالیاں پکڑے بیٹھے تھے۔ میں نے اسے نوید کی حرکت سے آگاہ کر دیا تھا۔

"اس کتے کی یہ مجال کہ تمہارے منہ لگے۔ حاسد کمینہ"۔

پرویز نے اسے ایک ہی سانس میں نجانے کتنی اخلاقی گالیوں سے نواز دیا۔ اس کے چہرے کی رنگت غصے سے بدلنے لگی تھی اور اعصاب کھینچ کر تن گئے تھے۔

"اس کتے کے پلے کو میں نے نالی کے کنارے سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا ہے اور یہ..."

اس نے دانت پیستے ہوئے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"چھوڑو بھی... میں نے تو پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا"

میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لئے کہا۔

اور اس کا موڈ بالکل ہی نارمل ہو گیا۔

☆☆☆

HBC
urdufans.com

چند روز کے بعد میں پرویز کے ہمراہ کراچی جا رہی تھی۔ ہوائی جہاز کا سفر، شاندار سازمی، پرس میں بے شمار نوٹ اور ایک خوبصورت نوجوان دولتمند کا ساتھ۔ شاندار مستقبل کے سپنے۔

میرا دماغ جہاز کے ساتھ ساتھ عرش پر پرواز کر رہا تھا۔ جہاز کے سفر کے دوران میں پرویز نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ تین مہینے کا تو بہانہ ہی کیا ہے۔ بس تین چار ماہ کے بعد اس کا تبادلہ بھی باہر ہو رہا ہے جہاں ہم دونوں اکٹھے ہی جائیں گے اور میرے بھٹکے ہوئے ذہن نے اس کی اس بات کو بھی قبول کر لیا۔ میں دل ہی دل میں مستقبل کے منصوبے بنانے لگی۔

''نجمہ! ہم مڈل ایسٹ پہنچتے ہی شادی کر لیں گے''۔

اس نے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہی خوشخبری سنا دی۔ کراچی میں ہمارا قیام ایک بنگلے میں ہوا جو شاید اس فرم نے اسی خاص مقصد کے لئے رکھا تھا۔

یہ بنگلہ صرف فرم کے افسران کے لئے تھا لیکن پرویز نے ''خصوصی طور'' سے اسے میرے لئے ''ریزرو'' کروایا تھا۔ ٹریننگ کا تو بہانہ ہی تھا۔ بس صبح دو تین گھنٹے کے لئے مجھے ایک ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا جس نے اس بڑے شہر میں بالکل جدید انداز کا یہ کلینک کھول رکھا تھا۔

وہ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ مڈل ایسٹ میں ہسپتال وغیرہ کے اوقات اور وہاں کام کرنے کے طور طریقے کیا ہیں۔ مجھے وہاں پرویز ہی چھوڑنے جاتا اور وہی لیکر واپس آیا کرتا تھا۔

ہماری شامیں سمندر کے کنارے اور راتیں شاندار ہوٹلوں میں بسر ہوتیں۔ سونے کے لئے ہم اسی بنگلے میں آ جاتے جس کا ایک علیحدہ کمرہ میرے لئے مخصوص تھا۔ کیا

مجال جو کبھی اس نے یہاں داخل ہونے کے بعد دروازہ بھی کھٹکھٹانے کی جرأت کی ہو۔ وہ میرا اعتماد، بھرپور اعتماد حاصل کر رہا تھا اور اس میں صد فی صد اسے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ شکار کو تھکا کر مارنے کے فن میں طاق تھا۔

وہ رات جس نے میری سیاہ بختیوں پر مہر تصدیق ثبت کی ویسی ہی راتوں جیسی ایک تھی جو میں اور پرویز پہلے ہی سے بسر کر رہے تھے۔ اس کا رویہ بھی کوئی غیر معمولی نہ تھا یا اگر کوئی ایسی بات تھی تو اس نے مجھے اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔

کمال کا اداکار تھا وہ ظالم... !

ہم دونوں اس رات انگریزی فلم کا آخری شو دیکھ کر لوٹے تھے۔ اس فلم نے میرے جذبات میں خاصی ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ فلم کا کمال تو یہ نہیں تھا۔ بس یوں جان لیجئے کہ بسا اوقات انسانی محسوسات پر ایک خاص کیفیت غالب ہو کر اسے کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ ہماری واپسی پر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔

''آؤ ایک کپ کافی کا ہی تمہارے ہاتھ سے پی لیں''۔۔

پرویز نے بڑی بے تکلفی سے میری کمر کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اکٹھے ہی کچن میں پہنچے تھے۔ یہاں کا ملازم بیرہ آج شاید چھٹی پر چلا گیا تھا۔ کافی کے دو مگ تھام کر ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ خلاف توقع آج پرویز بالکل میرے ساتھ چپٹ کر بیٹھا تھا۔ پچھلے چند دنوں ہی میں پرویز نے مجھے جن جہانوں سے آشنائی بہم پہنچائی تھی اس کے بعد سے میرے لئے اس کی یہ حرکت کوئی ایسی غیر معمولی نہیں تھی کہ میں اس کا نوٹس لیتی۔ اس لمحے میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی گذشتہ محرومیوں کا رونا رو کر میری محبت کو اپنی کائنات کا حاصل بتایا۔
اس دوران اس کی دراز دستی بھی جاری رہی۔ پھر وہ مرحلہ بھی آیا جب اس نے میرے ''لب

HBC
urdufans.com

"مسیں" کی خوشبو بکھرائی۔ مجھ پر ایک مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ جس میں اس کی چرب زبانی سے زیادہ اہم کردار اس گولی کا تھا جو اس نے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر کافی کے کپ میں ملا دی تھی۔

اس عالم نے مجھے تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ ہم دونوں اس گھناؤنے عمل سے گزر گئے جس کے بعد پاکیزگی اور تقدس کی سربفلک عمارتیں ریت کے ٹیلوں کی طرح گرنے لگتی ہیں۔ اپنے کنوار پن اور نسوانی تقدس کا خون میں نے اپنے ہاتھوں کیا تھا۔

نسوانی عظمت کی عظیم اور نازک سرحد کا یوں اچانک گر جانا کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ مجھ ایسی لڑکیوں کو اس حادثہ جانکاہ کے بعد مر جانا چاہئے لیکن تب تک میرے زندہ رہنے کا جواز یہی تھا کہ مجھے اپنے "لٹ جانے" کا احساس نہیں تھا۔

ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے پرویز نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ اس حادثے پر اظہار افسوس و ندامت کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ شرمندگی مجھے تھی کہ میں خود کو اس اکیلے کا اس سے زیادہ ذمہ دار گردانتی تھی۔ کچھ بھی ہو بہرحال اس میں میری رضامندی بھی شامل تھی۔ اس بات کی سمجھ تو مجھے بہت بعد میں آئی کہ میری آنکھیں ابھی تک ڈھنگ سے کیوں نہیں کھل رہی تھیں اور سر اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ اس کیفیت کا احساس ہوا بھی تو میں نے اس کا جواز اپنی "نفسیاتی کیفیت" کو قرار دیا جو اس حادثہ جانکاہ کا نتیجہ تھی۔

میں نے زندگی کتابوں میں نہیں پڑھی۔ خود پر وارد کر کے بیتائی ہے۔ تعلیم نے، معاشرے نے مجھے یہی بتایا اور سکھایا تھا کہ لڑکی تب تک لڑکی ہے جب تک وہ باکرہ رہے ورنہ وہ عورت کے منصب سے گر کر فاحشہ بن جاتی ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ جب تک

میں فاحشاؤں میں رہی خود کو باکرہ رکھا، اپنی عصمت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی۔ عورت کی سطح سے اتر کر مردانگی اپنائی اور مارشل آرٹس اس لئے سیکھنے چل دی کہ مجھے اپنی ماں اور اس کے گرد گھنال میاں جی کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ لوگ مجھے زبردستی اپنے راستے پر چلنے کو کہیں گے۔

لیکن آج ...

میں نے اپنے ہاتھوں اپنی رضامندی سے اپنی پاکیزگی کا خون کر دیا۔

میں نے بمشکل خود کو سمیٹا، اپنے ڈگمگاتے وجود کو سنبھالا اور باتھ روم کا رخ کیا۔

وہ رات کروٹوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ساری رات ایک ناکام خلش، اک پچھتاوہ، اک احساس گناہ مجھے ڈستا رہا۔ میں کمزور لمحوں کی گرفت میں سسکتی اور آنسو بہاتی رہی۔ آصف کئی مرتبہ سلگتا سوال بن کر میرے ذہن سے چپکا۔ اس نے مجھ سے کئی سوال کئے، کئی باتیں یاد دلائیں۔ اس سے کئے وعدوں کی یاد دلائی۔

اور میں...... بے بسی سے اپنا تکیہ آنسوؤں سے گیلا کرتی رہی۔ اس رات کم از کم یہ ضرور ہوا کہ آصف سے ملنے کی اگر کوئی خواہش میرے لاشعور میں ابھی چنگاری کی طرح سلگ رہی تھی تو راکھ ہو گئی۔ میں نے اپنا تجزیہ کیا اور ایمانداری سے یہی فیصلہ کیا کہ اب تو کم از کم اتمام حجت کے لئے بھی کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اب مجھے آصف کے حوالے سے کچھ سوچنے کا حق بھی نہیں تھا۔

علی الصبح پرویز نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار معافی مانگ رہا تھا۔ مجھ سے نارمل ہونے کی التجا کر رہا تھا۔ پھر مجھے اس لئے بھی "نارمل" ہونا پڑا کہ اچھا برا اگر میرا کوئی آسرا تھا تو یہی پرویز تھا۔

☆☆☆

ابھی مجھے آئے یہاں پندرہ بیس روز ہی گزرے تھے جب یہ قیامت ٹوٹی۔ میں بہرحال نرس تھی۔ اگلے ایک ماہ بعد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں نے پرویز کو اس حادثے کی خبر دے دی۔ تھوڑی دیر کے لئے کچھ خدشات نے میرے دل و دماغ میں سر ابھارا، لیکن پرویز نے اس بات کو ہنسی مذاق میں اڑا دیا۔ اُس کے لئے یہ معمول کی بات تھی۔

"تم تو خواہ مخواہ گھبرا گئی ہو بھئی کہہ جو دیا کہ بس تین ماہ کے اندر ہم باقاعدہ شادی کر لیں گے۔ مجھ میں تمہیں بھگا کر نہیں لے جانا چاہتا۔ میں تو تمہیں دلہن بنا کر اپنے بزرگوں کی اجازت سے لیکر جاؤں گا۔"

میرے اصرار اور بے چینی پر اُس نے مجھے مطمئن کرنا چاہا۔

اور میں مطمئن ہو گئی۔ اس بات کا ذکر میں نے کسی سے نہ کیا۔ دو ماہ کے بعد ہی میرا ویزا آ گیا۔ میرے ہمراہ دو اور لڑکیاں بھی جا رہی تھیں اور ہم سب کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں نرسنگ کے فرائض ادا کرنے تھے۔ تب تک میری نرسنگ کی تربیت نے مجھے بتا دیا تھا کہ اب میں لڑکی نہیں رہی عورت بن چکی ہوں فاحشہ عورت۔ جو مجھے میری ماں بنانا چاہتی تھی لیکن نہ بنا سکی اور یہاں بغیر کسی دباؤ کے بغیر کسی کی دھمکی کے محض ترغیب" کا ہتھیار چلا کر اس ظالم نے مجھے میری نظروں سے گرا دیا۔

مجھے وحشت ہو رہی تھی

اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا

خوف کے مارے میں آئینے کا سامنا نہیں کر پاتی تھی ۔ مجھے آئینے میں اپنے بجائے ایک ڈائن کا سراپا دکھائی دیتا تھا

ایک ایسی ڈائن جس نے خود کو بھی چاٹ لیا ہو

urdufans.com

ڈر لگتا تھا کہیں اپنے ہاتھوں اپنی جان نہ لے لوں

کمن آنے لگی تھی مجھے اپنے آپ سے

جب بھی مجھے ضمیر نے مجرم بنا کر آصف کی عدالت میں پیش کیا۔ میں نے رو رو کر اس سے اپنے لئے سزائے موت کی التجا کی

لیکن میری التجائیں سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتیں۔ شاید میرے اس گناہ عظیم کو قدرت نے معاف نہیں کیا تھا اور مجھے زندہ درگور کر کے سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا

تین روز بعد کراچی میں ہماری نام نہاد ٹریننگ کا خاتمہ ہو گیا

میں اتنی بے وقوف تھی کہ اس دوران اس بات کا بھی اندازہ نہ کر سکی کہ آخر میرے ساتھ ٹریننگ کے لئے آنے والی دونوں نرسیں بھی مجھ سے کوئی بات شیئر کیوں نہیں کرتیں۔ انہوں نے مجھے آج تک اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے نام کا علم بھی اس لئے تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کو کبھی کبھی مخاطب کرنا پڑتا تھا ان کا قیام کہاں تھا

کس شہر سے ان کا تعلق تھا؟

ان سوالوں کے جوابات مجھے کبھی نہ مل سکے۔

میں کراچی سے گھر واپس لوٹی تو والدین کے لئے پرویز نے بطور خاص اچھی خاصی شاپنگ کر دی تھی۔ وہ تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہیں یہی کچھ تو درکار تھا۔

ایک ہفتے بعد میری روانگی تھی اس دوران ایک دن صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے میں چوری چھپے عابدہ سے ملنے چلی گئی۔ جس نے مجھے گلے لگا کر سسکیاں لیکر روتے ہوئے احساس دلایا کہ وہ مجھے کتنا مس کرتی ہے جب میں نے بتایا کہ پانچ

urdufans.com

[illegible]

☆☆☆

[illegible]

[illegible] بھی شادی کی اجازت [illegible]

[illegible]

رکھتی تھی۔

ہم تینوں کو ایک خوبصورت اور جدید طرز کی بنی ہوئی کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ میں اسے محل ہی کہوں گی۔ اس محل میں پہلے سے بے شمار کمرے سجائے گئے تھے۔ ہمارا استقبال ایک غیر ملکی خاتون نے مسکراتے ہوئے کیا۔ عمارت کے باہر نصب بورڈ پر "بورڈنگ ہاؤس" تحریر تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور سے نوٹ کی کہ ہوائی اڈے سے یہاں پہنچنے تک ہمیں جتنے لوگوں سے بھی پالا پڑا انہوں نے ہمیں بالکل بیوپاریوں جیسی نظروں سے دیکھا تھا۔ ہوسٹل میں ہمیں سب سے اوپر والی منزل پر الگ الگ کمرے الاٹ کئے گئے اور وہ بوڑھی حرافہ ہماری انچارج تھی۔

وہ رات میں نے ڈرتے ڈرتے گزاری۔ یہاں دوسرے ممالک کی بھی دس بارہ لڑکیاں رہائش پذیر تھیں لیکن میں نے وہاں کسی کو بھی ضرورت کے بغیر ایک دوسرے سے بات کرتے نہ پایا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انہیں سختی سے ایک دوسرے سے بولنے کی ممانعت کی گئی ہو۔

مجھے کھانا کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ صبح کے وقت ایک ویگن میں جس پر ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا مجھے ایک پرائیویٹ ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اسے ہسپتال تو نہیں کہوں گی۔ ایک ڈاکٹر کی دکان ہی سمجھیں جس میں شاید دو تین مریضوں کے داخلے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہاں اسی پاکستانی مرد نے جو مجھے ہوائی اڈے پر لینے آیا تھا بتایا کہ مجھے روزانہ چھ گھنٹے کام کرنا پڑے گا اور شام کے وقت گاڑی ہوسٹل چھوڑ آیا کرے گی جہاں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اس کی بے حیا اور بے باک نظروں سے پہلے تو میں بری طرح خوفزدہ ہو گئی پھر میں نے تمام ڈر اور خوف کو دل سے نکال باہر پھینکا۔ ظاہر ہے کمپنی ہی ہماری رہائش کی ذمہ

urdufans.com

داری تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کا بندوبست بھی کر دیا تھا اور کام بھی بتا دیا تھا۔ میں نے وہ ہسپتال ہی سے گھر لکھا جس میں گھر والوں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب ان کا دیرینہ خواب پورا ہو جائے گا اور میں ان کو جلد ہی "باہر کا مال" بھیجنا شروع کر دوں گی۔ شام کو مجھے وہی ویگن واپس ہوسٹل لے آئی۔ دوسرا خط عابدہ کو لکھا جس کے ساتھ نومولود کے لئے کچھ کپڑوں کا پارسل بھی روانہ کیا تھا لیکن ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے خط نہ لکھے۔ پانچ چھ روز اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز میں نے انچارج حرافہ سے پرویز کے متعلق پوچھا تو اس نے بڑی مکاری سے مسکرا کر بڑے نخش لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"آ جائے گا اتنی بے چینی بھی کیا؟"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں لیکن یہاں آنے سے پہلے پرویز نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہاں کا ماحول بڑا آزاد ہے گھبرانا نہیں بلکہ خود کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنا   کاش میں نے اس کی کسی بات کو تو سمجھ لیا ہوتا !!

میں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ شام کو اسی حرافہ نے مجھ سے پوچھا کہ "پاکستان کوئی ڈاک تو نہیں بھیجنی !!"

میں نے جواب نفی میں دیا۔

"گھر خط بھی نہیں لکھا کیا؟"

"لکھ دیا ہے۔"

میں نے قدرے غصے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جلدی سمجھ جاؤ گی۔ بڑی دیکھی ہیں تم جیسی۔"

اس نے جاتے ہوئے کہا۔ میں پہلے تو چونکی پھر خود ہی مطمئن بھی ہو گئی۔

اگلے روز چھٹی تھی۔ ہر شام ان لڑکیوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہمارے شہر کے ہوٹلوں کی طرح یہاں بھی کاریں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کار دروازے پر رکتی اور ایک بنی سنوری لڑکی کار میں آنے والے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ چلی جاتی۔ آنے والا اس بوڑھی عورت سے سارا معاملہ طے پا جاتا۔

"یا اللہ میں کس عذاب میں پھنس گئی ہوں۔"

میں نے سوچا۔ یہ خیال آیا کہ یہ سب کچھ یہاں نہیں ہوتا۔ یہ انسان کا اپنا کردار ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی تو یہی باتیں ہیں یہی کچھ ہوا کرتی تھیں لیکن سب کی سب نہیں صرف چند تھیں۔ اگر میں وہاں محفوظ رہی ہوں تو یہاں بھی رہوں گی۔ بہر حال اپنے کردار کو ٹھیک رکھنا اپنے بس میں ہوتا ہے۔ کوئی لوٹنا چاہے تو اسے پیچھے نہیں کھینچا جا سکتا۔ مجھے اس بات کا یقین بھی تھا کہ جلد ہی پرویز آ جائے گا اور ہم شادی کر لیں گے۔

پرویز واقعی ان دنوں رات کی شفٹ سے آ گیا اور آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بڑی مشکل سے یہ ہفتہ گزارا ہے اور کمپنی کے افسر کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر یہاں آ گیا ہے۔

میں نے اپنے دل میں چھپے اس کرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب اس سے وہاں سے نکلنے سے متعلق پوچھا تو اس نے ہنس کر بات ہی اڑا دی۔

"تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں آئی بیوقوف"

"کیا؟"

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"انہیں ان باتوں کا برا نہیں لگتا۔ یہ ان کے پیشے ہیں۔"

لیکن میں ان باتوں کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے اس لہجے میں مجھے سے اس کا جواب دیا تھا اس نے ایک مرتبہ مجھے گزار کر رکھ دیا مجھے یوں لگا جیسے اپنا سب کچھ بات پر کوئی تام جھام پہنا دیا۔ میں بہت ہی بھڑکی تھی اور اس نے مجھے سے اسی لہجے میں بات کی جب اس نے ایک ہی فیصلہ کیا لیکن میں نہیں سمجھ پا رہی تھی لیکن اس نے اسی بات کا رخ بدل دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ہم دونوں ایک شاندار کار میں بیٹھ کر پرویز کے ایک دوست کے گھر روانہ ہو گئے۔ سارے راستے وہ مجھے بتاتا رہا کہ یہ لڑکیاں یہاں آزادانہ زندگی گزارتی ہیں وہ کتنی شاندار زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے لہجے میں وہی ترغیب دلانے کا انداز تھا۔ پیشہ ورانہ کی زندگی میں ہوتا ہے۔ آج وہ تو اپنی سادگی پر خود ہی مرجانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اس وقت بھی اس کی نیت پر شک نہ کیا اور یہی سمجھا کہ وہ مجھے یہاں کی اونچ نیچ سے خبردار کر رہا ہے۔

☆☆☆

انسان کی عقل پر پردہ پڑ جائے تو سب سے پہلے اس سے اچھے اور برے کی شناخت کا شعور چھن جاتا ہے اور وہ بے بسی سے اپنے لٹنے کا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔

مجھے قدرت نے قدم قدم پر خبردار کیا لیکن وہ خوف جو میرے اندر محبت اور احساس عدم تحفظ کی صورت میں تھا اس خوف نے مجھے اندر ہی اندر کھا لیا تھا۔ میں نے ابھی تک پرویز کی ہر بات کو ایسے ہی سمجھا جیسے وہ سمجھانا چاہتا تھا۔

پرویز کا دوست ایک پاکستانی سرمایہ دار تھا جس کی عمر کم از کم میرے والد کے برابر تھی۔ اس شخص کا شمار یہاں کے متمول لوگوں میں ہوتا تھا اور اس کو اس ملک کی شہریت بھی حاصل تھی۔ مقامی شیوخ سے اس کی کاروباری دوستی تھی۔ ان ساری باتوں کا علم

مجھے راستے ہی میں ہو گیا تھا۔ پرویز نے تو مجھے یہ سب کچھ کسی اور ہی نکتہ نظر سے بتایا تھا لیکن میری بے وقوفی کا اندازہ فرمایئے کہ میں دل ہی دل میں اس بات سے مرعوب ہو رہی تھی کہ میرے محبوب کے تعلقات کتنے بڑے بڑے لوگوں سے ہیں۔

اس شخص نے بڑی فراخدلی سے ہمارا استقبال کیا اور مجھ سے زبردستی مصافحہ بھی کر لیا۔ پرویز نے مجھے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ مجھے یہاں آ کر مغربی طور طریقے اپنانا ہوں گے اور ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا ہو گا۔ ہم ایک شاندار کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یہاں ان دونوں نے شراب بھی پی تھی اور پرویز کے اصرار ہونے پر میں نے ہی ان دونوں کو شراب بنا کر پیش کی۔ مجھے شراب بنانے اور پیش کرنے کا طریقہ اس نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا اور اس بات کی بھی قسم کھائی تھی کہ آج کے بعد وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ میرے غصہ کرنے پر وہ طیش میں آ کر بولا "ضروری نہیں کہ جو چیز ہمارے یہاں معیوب ہو وہ دنیا بھر میں بری سمجھی جائے۔ تمہارے ممی ڈیڈی تو اتنے ایڈوانس ہیں انہوں نے کم از کم یہ تو بتا دیا ہوتا"

اس نے غصے سے کہا۔

آخر وہ میرا محبوب تھا۔ میں نے اس کی ناراضی مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ شراب پینے کے دوران وہ شخص اپنی ہوسناک نظروں سے میرا بھرپور جائزہ لیتا رہا۔ پرویز نے مجھے خاص طور سے وہ لباس پہننے کو دیا تھا جو وہ خود میرے لئے لایا تھا۔ نجانے لباس پہن کر بھی میں کیوں خود کو برہنہ محسوس کر رہی تھی۔ بالکل خوفزدہ ہو گئی تھی میں لیکن کیا کرتی؟

پرویز تو ٹائلٹ کے بہانے باہر چلا گیا اور میں اکیلی اندر رہ گئی۔ پرویز کے باہر ... نے مجھ پر دست درازی شروع کر دی۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات ... میں نے پہلے تو یہی سمجھا کہ یہ شراب کے نشے میں بہک گیا ہے۔ میں اسے خود

MBC urdufans.com

سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب وہ قابو ہی نہ آیا تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی جہاں برآمدے میں پرویز کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔

"پرویز! پرویز! وہ ... وہ مجھے ..."

میرے منہ سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"اوہ نجمہ! تمہیں نجانے کب سمجھ آئے گی۔ آخر "پینڈو" ہی نکلی نا۔!"

اتنا کہہ کر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ کیا تھا چھوٹا سا سینما ہال دکھائی دے رہا تھا۔

"یہاں بیٹھو۔"

اس نے مجھے ایک کونے میں رکھی آرام دہ کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ میں حیران و ششدر وہاں بیٹھ گئی۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ کیا کرنے والا ہے۔ کمرے میں موجود پروجیکٹر کا بٹن دبا کر وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اب پردہ سکرین پر ایک فلم چل رہی تھی۔

چند لمحوں تک تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جب ذرا گرد و پیش کا احساس ہوا تو یکدم ایک جھٹکا سا لگا جیسے بدن کسی ننگی تار سے چھو گیا ہو۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سکرین کو گھورنے لگی جہاں اس کمرے کا ایک ایک منظر نظر آ رہا تھا جہاں میں نے پرویز کے ساتھ تنہائی میں کئی راتیں گزاری تھیں۔ کمرے کے کسی خفیہ گوشے میں چھپے کیمرے نے میرے سارے گناہ سلولائیڈ پر محفوظ کر لئے تھے۔ کتنا ظالمانہ طریقہ واردات تھا ان لوگوں کا۔

جوں جوں فلم چلتی جا رہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے سے مختلف مناظر گزرتے جا رہے تھے، میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جلد ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے

AK OVER

میں پاگل ہو جاؤں گی۔ کوئی نادیدہ قوت زور زور سے میرے سر پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ کمرے کی ساری چیزیں گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں بے اختیار زور سے چلا اٹھی۔

"بند کرو اسے خدا کے لئے اسے بند کرو۔"

"چلاتی کیوں ہو..."

اس نے شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے کیمرہ بند کر دیا۔

"کمینے، کتے، ذلیل، دھوکے باز"۔

نجانے دنیا جہان کے کون کون سے القابات سے میں نے اسے نوازا لیکن وہ بے شرموں کی طرح مسکراتا رہا۔ میں پھٹ پڑی، بچوں کی طرح سسکیاں لیتی ہوئی اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ گڑگڑاتے ہوئے التجا کی اور خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ میرے پیٹ میں اس کا بچہ ہے۔ مجھ پر رحم کرے۔

"اگر میرے کہنے پر عمل کرتی رہی تو زندگی بھر عیش کرو گی، ورنہ یاد رکھو اس فلم کی درجنوں کاپیاں ہمارے پاس محفوظ رہتی ہیں۔ تمہاری ملازمت برقرار رہے گی اور ہر ماہ پانچ ہزار روپیہ تمہارے ماں باپ کو پہنچتا رہے گا سال میں ایک بار چھٹی بھی اور زمانے بھر کی سہولتیں لیکن صرف تعاون کی صورت میں ورنہ! تمہارا پاسپورٹ ہمارے پاس ہے۔ یہاں کوئی تمہاری فریاد پر کان نہیں دھرے گا۔ الٹا تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا اور جو حشر تمہارا ہوگا وہ تو ہوگا ہی لیکن تمہاری بہن تمہارے ماں باپ سب بے گناہ برباد ہو جائیں گے...."

اس نے دھمکی آمیز اور ملائمت بھرے لہجے میں بات کی۔

"بچہ [illegible] خدا [illegible] بچہ..."

[illegible] سے [illegible] سہم گئی۔ میں بہت بری طرح جکڑی گئی تھی۔

بظاہر آزاد لیکن اندر سے مکمل قیدی۔ میرے احساسات شل ہو گئے تھے۔ دماغ نے جیسے کام ہی بند کر دیا تھا۔

"شاباش اب بھی ہو۔ پہلے ہی سمجھ جاتیں تو اتنی تکلیف ہی نہ کرنی پڑتی"۔

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ مجھے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ سوچتی ہوں میں اس وقت پاگل کیوں نہ ہو گئی۔ آخر کون سی کسر رہ گئی تھی باقی۔ میں مردہ سی اس کے پیچھے پیچھے کھنچی چلی جا رہی تھی۔

"رہا بچے کا معاملہ تم خود نرس ہو اس کا علاج بخوبی جانتی ہو۔ اگر چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مکمل مدد کر سکتا ہوں"۔

اس نے مجھے اسی کمرے میں جس سے میں نکل کر بھاگی تھی، دھکیلتے ہوئے کہا۔

کمرے میں وہ شیطان پہلے سے میرا منتظر تھا۔ ساری رات وہ میری بوٹیاں نوچتا رہا۔ میں روتی رہی۔ اپنے نصیبوں کا رونا۔ سسکتی رہی۔ اپنے اپنے ماں باپ کا ماتم کرتی رہی اور لٹتی رہی۔ پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا جب آنسوؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ کوئی رونا بھی چاہے تو رو نہیں پاتا۔ میں پتھر کی مورت بن چکی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی تو تمام صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔

صبح پرویز مجھے خود ہی ہوسٹل چھوڑ آیا۔ یہاں وہ حرافہ میری منتظر تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔

"آئندہ ان کا کہنا مانتی رہنا اور تم بھی ذرا خیال رکھنا۔"

اس نے مجھے حرافہ کو سونپتے ہوئے کہا۔ جس نے مجھے قصائیوں کی طرح پکڑا اور اوپر لے گئی۔

"آرام کرلو تھک گئی ہو گی۔ اب تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی ہے جب تک [illegible]

گھومو پھرو۔ سیر کرنے کو دل چاہے تو مجھے بتا دینا۔"

اس نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا، تین چار روز بعد ہی میں نے اپنی زندگی کا بدترین گناہ بھی کر لیا اور اپنے پاپ کی نشانی کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیا۔

☆☆☆

urdufans.com

چند ہفتے مجھے کسی نے نہ چھیڑا۔ اس دوران مجھے دنیا بھر کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ میرے ہاتھ کا لکھا خط "سنسر" ہونے کے بعد پوسٹ کیا جاتا تھا۔ اس دوران ماں کے خط بھی آنے لگے جو میری طرف سے اتنے پیسے ملنے پر بے حد خوش تھی اور میری "مزید ترقی" کے لئے دعا بھی مانگتی تھی۔ اس نے اپنے روایتی انداز میں لکھا تھا کہ میری ساتھی نرسوں کو اس نے خاص طور پر میری طرف سے بھیجا گیا پانچ ہزار کا ڈرافٹ دکھایا ہے۔ وہ سب جل بھن کر رہ گئی ہیں۔

یہی کچھ تو چاہتی تھی وہ۔

کئی دفعہ جی چاہا کہ عابدہ کو خط لکھوں، لیکن میں نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے نتائج کتنے ہولناک ہوں گے کیونکہ ابھی تک خوش قسمتی سے اس کا ایڈریس میں نے پرویز کو بھی نہیں بتایا تھا۔ شاید قدرت نے اسے میری ماں کے شر سے محفوظ رکھنے کا پروگرام بھی طے کر لیا تھا۔

رو بصحت ہوتے ہی مجھے "کام" پر لگا دیا گیا۔ میں معمول کے مطابق ڈاکٹر کے ہسپتال پر جاتی۔ وہیں میری راتوں کا مول چکایا جاتا اور سر شام کوئی قیمتی کار آ کر مجھے "قربان گاہ" کی طرف لے جاتی جہاں کوئی نہ کوئی وحشی درندہ میری بوٹیاں نوچتا رہتا۔ صبح ہونے پر وہی کار مجھے میری "خصوصی بخشش" سمیت میرے ٹھکانے پر واپس چھوڑ جاتی۔

ان لوگوں کی نگرانی مجھ پر بہت سخت تھی۔ میرے ہوسٹل سے ہسپتال تک آنے جانے پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ چھ سات ماہ بعد جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب شکار نکل کر نہیں جا سکتا تو انہوں نے قدرے ڈھیل دے دی۔ اب میں اپنی مرضی سے کسی لڑکی کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کر لیا کرتی تھی۔

ایک روز اسی طرح میں ایک سٹور میں داخل ہو رہی تھی کہ اچانک نوید سے ٹکرا گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ چونکا نہیں۔

''اوہ تم۔ تو پہنچ گئی نہ بالآخر ٹھکانے پر۔ ''

اس کے لفظوں کی کاٹ مجھے کھا گئی۔

''مجھے معاف کر دینا بھائی! میں نے تمہیں غلط سمجھا'' ...

میں سسک پڑی۔ ہم دونوں ایک کونے میں کھڑے تھے۔ یہ جگہ قدرے محفوظ تھی کم از کم گفتگو کرنے کے لئے۔

''خبردار'' وہ بھڑک اٹھا۔ ''میں تمہارا بھائی اس وقت تک تھا جب تک تم باکرہ تھیں۔ اب میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ میں ایک برا انسان تھا اس کے باوجود میں نے تمہاری بھلائی چاہی اور تمہیں سمجھایا کہ اس شیطان کے پنجے سے بچ جاؤ۔ الٹا تم نے میری شکایت کر دی میرا کیا بگڑا اس نجمہ! مجھ جیسے لوگوں کو کیا کمی ہے نوکریوں کی۔ ہاں تمہاری بات الگ ہے یاد رکھنا تم قیامت تک اسی جہنم کا ایندھن بنی رہو گی۔ تم مرنا چاہو گی اور اپنی مرضی سے یہ لوگ تمہیں مرنے نہیں دیں گے'' ...

وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا۔

میں بے بسی سے سنتی رہی۔ پھر وہ میرا جواب سنے بغیر مجھے ''خدا حافظ'' کہہ کر چلا گیا۔ میں بدبخت آنسو بہاتی رہی۔ میری ساتھی جو ہوسٹل سے میرے ساتھ آئی تھی نوید کو

urdufans.com

''کا یک'' سمجھ کر الگ جا کھڑی ہوئی تھی۔ نوید کے جاتے ہی وہ میرے نزدیک آئی۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے کہا

''کمال ہے! ابھی تک تمہارے آنسوؤں کے سوتے خشک نہیں ہوئے۔ بڑی خوش قسمت ہو۔ تمہیں رونا تو آ جاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ اب رو بھی نہیں سکتے''

اس کی آواز میں ایک عالم کی یاسیت سمٹ آئی تھی۔

''نجمہ!'' اس نے میرا بازو بڑی ہمدردی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا

''اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لو۔ ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا کہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے لٹنے کا تماشہ خود ہی دیکھتے رہیں۔''

''نہیں''

میں نے بازو جھٹک کر الگ کر لیا۔

اس لمحے مجھ میں وہ نجمہ بیدار ہو گئی جسے پہلے روز مارشل آرٹس کی کلاس میں دیکھ کر تبتی لاماؤں جیسی شکل والے انسٹرکٹر نے کہا تھا

''مس نجمہ! تم آگے نکلو گی''۔

''میں بے بسی سے یہ سب کچھ نہیں برداشت کروں گی۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس لمحے مجھے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا کر لو گی تم؟''

اس نے کھوکھلی مسکراہٹ اچھالی۔

''میں اس موذی کا خون پی جاؤں گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔''

میرا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

playing at the highest level in bid to extend his international career.
Meanwhile, Wenger hit back at Nani, the Manchester United star who dismissed Arsenal's title hopes, claiming only United or Chelsea can be champions.
Wenger said: "Everybody has a different opinion
We live in a society where everybody
Im-Bru 2nd Division

[illegible]

urdufans.com

[illegible]

urdujians.com

[illegible] [illegible] کے [illegible]

[illegible]

[illegible] آ [illegible]

اس نے اپنے [illegible] بچے۔ [illegible]

[illegible] اس نے [illegible] کی [illegible]

[illegible] ایسے [illegible] سے [illegible] کر رہی تھی [illegible]
[illegible] نے جا [illegible] رہی تھی [illegible] آج ایک [illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] خوش [illegible] خدا کا شکر ہوا کہ اسے شک نہیں [illegible]
[illegible] اس [illegible] مسکراہٹ کی [illegible] جانے کے لئے [illegible] سے [illegible]
[illegible]

[illegible] ایک [illegible] کار مجھے لینے آ گئی۔ ایسی کاریں [illegible]
[illegible] لیکن مجھے آج [illegible] مرتبہ ایسی [illegible] میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔ [illegible]
[illegible] کی [illegible] دروازے پر [illegible]
[illegible] دروازہ کھلا [illegible] ایک [illegible]
[illegible] کی [illegible] خدمت [illegible]
[illegible] ایک [illegible]

[illegible] میں نے [illegible] سے [illegible] سمجھا تھا لیکن میری حیرت کی
[illegible] میں [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
میں نے [illegible] باتیں [illegible]
[illegible] اس سے رخصت
[illegible] رات میں نے اپنے [illegible] اور ایسا ہی
[illegible] میں نے [illegible] سے [illegible]
[illegible] میں نے اس [illegible]
[illegible] روز میں [illegible] کی [illegible] جب [illegible] خوشی سے
[illegible] میری [illegible]
[illegible] کے [illegible] تیار [illegible]

☆☆☆

[illegible] آ گیا جب [illegible] کمرے میں داخل ہو
[illegible] یہاں تک پہنچے کے [illegible] میں نے [illegible] ایک [illegible] کی تعمیل کی تھی ورنہ
حالات میں [illegible] گوارا نہ کرتی۔

[illegible] میں تو اسے [illegible] کی [illegible] پہلے ہی [illegible] آ اور جا چکی
تھیں۔ [illegible] نے میری قیمت [illegible] کی [illegible] چکا
تھے۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ [illegible] سے اپنے [illegible] کی [illegible] طلب کر
[illegible] ایک [illegible] کے [illegible] دوسرے کے
[illegible] کر دیا۔ اب [illegible]
[illegible] میری [illegible]
لیکن مجھے خوشی [illegible] کا [illegible] پ [illegible] گیا۔ [illegible]

.com

[illegible]

اس نے مجھے [illegible]

[illegible]

[illegible] نہ اچھی ہوئی

نہ [illegible] تھا۔

[illegible] ؟

اب یہ مسئلہ نہیں [illegible] تجربے نے بتایا [illegible]

[illegible] کی تسکین [illegible]

[illegible] کا [illegible] تھے وہاں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

HBC
urdufans.com

[illegible] تھی۔ یہاں [illegible] تو اس [illegible] بلانے [illegible] ایسے مختلف ممالک [illegible] دونوں نے [illegible] کر [illegible] ہو گیا۔

منصور نے [illegible] مجھے یہ [illegible] تھا کہ [illegible] نے بھی اس سے یہ سوال کیا تھا [illegible] اس کا کوئی تعلق [illegible] ہے۔

ان دنوں اس کی کمپنی کے ہیڈ آفس [illegible] میں ایک اہم میٹنگ میں اس کا جانا ضروری تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا [illegible] اس کی ہم سفر [illegible]

میری کمپنی والوں نے تو میرا پاسپورٹ اپنے قبضے میں کر لیا تھا لیکن منصور نے [illegible] سے تیسرے دن میرا پاسپورٹ مجھے تھما دیا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ جلد ہی [illegible] مجھے فرانس کی شہریت [illegible] کیونکہ اس نے مجھے اپنے ساتھ ہی فرانس لے جانے کا ارادہ [illegible] تو لیکن میں نے ایک [illegible] کی طرح اسے [illegible] معاملات [illegible] جلدی [illegible] آنے کی ہدایت کی تھی [illegible] وقت [illegible] انتظار تھا۔

منصور کی پیرس روانگی کے [illegible] ہی دن جب پرویز کا فون آیا تو میرا [illegible] تمام [illegible] خوشی [illegible] جذبات [illegible] ایک [illegible] بدن میں [illegible] گئی [illegible] نے اب تک [illegible] کے لئے تیار [illegible] اس ملک سے کسی [illegible] کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

اس وقت میں اپنی خوش [illegible] سامنے [illegible] پر نظریں [illegible] اور [illegible] جب [illegible] کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے [illegible] تو [illegible] جس نے اب تک مجھے [illegible] فون کر لئے تھے۔

[illegible] کی [illegible] میں [illegible] میں اس [illegible] سبھی [illegible] تھی [illegible] تھا

میں نے [illegible] تو

اس طرح میں [illegible] اور [illegible] سے کوئی [illegible] نہیں چل [illegible] کیونکہ [illegible] بات [illegible] نمبر [illegible] اس کے خصوص [illegible] کے ہاتھوں [illegible] تھی۔

پرویز کو میں نے [illegible] تھا [illegible] مجھے [illegible] فون کیا کرے [illegible] وقت [illegible] آپ [illegible] تھا [illegible] ہدایت دی تھی کہ کوئی بھی [illegible] آواز پر ہی بات کرے۔

ان دنوں ایسے [illegible] انتظام [illegible] تھی لیکن [illegible] تھی کہ ایسے حالات بھی پیدا نہیں ہوں گے۔

میں نے فون [illegible] سمجھ کر [illegible] دوسری طرف [illegible] سے [illegible] لیکن دوسری طرف پرویز تھا

"کیا میں مسز منصور سے بات کر سکتا ہوں"

اس کے لہجے سے شرارت [illegible] اور [illegible] رہی تھی۔

"[illegible] پرویز [illegible] صرف [illegible]"

HBC
urdufans.com

[illegible] نے [illegible]۔

[illegible]

[illegible] شاید ابھی تک مجھے [illegible] باقی [illegible]

[illegible] جذبات کا [illegible] دیا اور اس رات [illegible] نے [illegible] بتایا تھا کہ منصور کی پانچ [illegible] درمیان رات اکٹھے بسر کرنے [illegible]

[illegible]

[illegible] منصور [illegible] دکان میں [illegible] اور واپسی [illegible] کی نظروں سے [illegible]

جس راستے سے اس نے واپس [illegible] تھا اس پر [illegible] اس نے احتیاطاً [illegible] میں کسی بھی [illegible] کرواتے تھے۔ ان کے [illegible] حقیقت کی میں نے اس [illegible] ابھی [illegible] رات [illegible] میں [illegible] سے کسی بھی [illegible] نے مجھے رات کا [illegible] چلی گئی۔

[illegible] سڑک [illegible]

[illegible]

HBC
urdufan's.com

[illegible]

[illegible]

میں نے [illegible]

[illegible] میں اس کے استقبال کے لیے [illegible]

[illegible]

[illegible]

بشیر [illegible] ایک [illegible]

رات [illegible] آئی اور میں نے ایک [illegible]

[illegible] کی آواز [illegible] تھی۔ میں

[illegible] کی آنکھوں نے

[illegible] شروع کر دی۔

دونوں [illegible]

اور اس کی [illegible]

[illegible] پھر انہوں نے ایک

[illegible] آواز کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] تھا۔

[illegible]

لوگوں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے [illegible]

[illegible]

اور لوگ [illegible]

ایک [illegible]

[illegible]

جب تک [illegible]

[illegible]

[illegible] میں نے [illegible]

کہا۔ اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

urdufans.com

[illegible]

[illegible]

HBC
urdufans.com

HBC
urdufans.com

رات [illegible] کے بستر میں لیٹے [illegible] ایک بے نام سا خوف بھی میرے [illegible]
[illegible] کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ لوگ مجھے [illegible] ملک میں
[illegible] لے جائیں گے [illegible] موت کا [illegible] لیا جائے گا۔ میں ان [illegible]
[illegible] ہو چکی تھی۔ مجھے [illegible] تھی کہ وہ تمام میری ساتھی [illegible] پر چڑھا
[illegible] یقیناً یہی سمجھیں گے کہ [illegible] دشمن [illegible]
[illegible] والی [illegible]
[illegible] کی بات [illegible]
[illegible] والی سزا کے تصور ہی سے رونگٹے
[illegible] ہو جاتے تھے۔

[illegible] "[illegible]" [illegible] دیا۔
[illegible] بات [illegible]
[illegible] لیا۔
[illegible] تشویش ہوئی۔ میں نے
[illegible] مجھے اپنے ساتھ رکھا
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] پر فخر کرتے تھے۔ میں باقی [illegible]
[illegible] ضرورت [illegible]
[illegible] کی زندگی [illegible] تھی۔

کبھی کبھی اچانک [illegible]
[illegible] جاتی۔ تب آصف [illegible] ماضی میں [illegible] تھی۔ میں اپنی [illegible]
کوشش کے باوجود کبھی بھی اپنے ماضی کو [illegible]
[illegible] نہیں تھی۔ [illegible] اب مجھے
مجبوراً [illegible] پڑی تھی۔ اب یہ میری ضرورت [illegible] جب [illegible]
[illegible]
عجیب سا لگتا تھا۔

لیکن [illegible] کہیے کہ جتنا فرار میں نے ان یادوں سے [illegible] پایا، اتنا
ہی میرے ضمیر نے مجھے احساس کی صلیب پر لٹکایا۔

چنانچہ [illegible] آصف کو کھونے [illegible] میری جان [illegible] تھا۔ میں نے
اُسے بھلانے کی بہتیری کوشش کی [illegible] میرے پاس اپنی
[illegible] محبت کی نشانی [illegible] کی شکل میں موجود تھی۔ [illegible]
بیٹے سے الگ [illegible] حسن اتفاق [illegible] یا پھر اس [illegible] نے
اسے [illegible] نہ جانا۔

میں سسک سسک کر جی رہی تھی اور جینا [illegible]

HBC
urdufans.com

[illegible] نے آپ سے [illegible] میں کہا تھا کہ [illegible] لوگوں کے لیے [illegible] ت [illegible] زندگی باعث [illegible]

[illegible] ابھی [illegible] وقت ایک [illegible] کے ساتھ [illegible] تھی اور [illegible] کو [illegible] سے [illegible] درخواست بھی [illegible] تھی کہ وہ بھی مجھ سے [illegible] ۔ یہ واقعی [illegible] تھی کہ میری بات [illegible] سمجھ نے کے [illegible] بعد [illegible]۔

* * *

[illegible] رات [illegible] سے [illegible] ۔ اب مجھے اپنی [illegible] کوئی آدمی [illegible] لیکن [illegible] نے مجھے [illegible] کے [illegible] ۔ میں نے یہاں کے [illegible] اور اندھیرے [illegible] کے [illegible] مجھے [illegible] خود کو انسان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی تھی۔

[illegible] زندگی کا مقصد [illegible] شراب، عورت اور [illegible] تھا [illegible] اس [illegible] میں اس [illegible] ایک [illegible] تھی۔ [illegible] تھا۔ آپ [illegible] میں [illegible] کے [illegible] ۔ میں نے [illegible] کہ میرا [illegible] سب سے [illegible]

[illegible] کے [illegible] ۔ یورپ کے بڑے بڑے بنکوں میں میرے نام [illegible] تھے

[illegible] میں نے یہاں ایک [illegible]

[illegible] تھی [illegible] یہاں [illegible] اس بات کی [illegible] کہ اس [illegible] تھا [illegible]

[illegible] تھے [illegible] سنبھالے ہوئے تھے۔ [illegible] عوام کی قسمت [illegible] سال تھا۔

شاید آپ میری اس بات پر یقین نہ کریں [illegible] کے باوجود مجھے [illegible] خاندانوں میں کوئی ایک بھی [illegible]

مغربی [illegible] میں [illegible] کو خصوصی اہتمام سے [illegible] ہے۔ [illegible] منصور کا یہ محل شاید دو سو سال پرانا تھا اور [illegible] کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا کرتے تھے۔ [illegible] اس محل کی [illegible] اور [illegible] میں [illegible] کوئی نہ کوئی محفل [illegible] رہتی تھی۔

ان محافل میں شراب [illegible] اپنے مکمل [illegible] ۔ اس محل کا [illegible] نا صرف کسی بھی ملک، مذہب [illegible] سے [illegible] اپنے تمام [illegible] کا مالک تھا۔ یہاں [illegible] ملک کے بڑے بڑے [illegible] مہمان آیا کرتے تھے۔ یہ لوگ [illegible] اشارہ [illegible] زندگی [illegible] بکھر جایا کرتی تھی۔

لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی [illegible] منصور [illegible]

HB
urdufans.com

حیثیت [illegible] تھے [illegible]

[illegible] قدرت رکھتا۔

[illegible]

منصور مجھے [illegible] اس بات کا یقین دلانے کی کوشش ضرور

[illegible] بھی کر سکتا ہے حتیٰ کہ [illegible]

[illegible] سکتا ہے۔

[illegible] بے نیاز ہو چکی تھی [illegible] حیثیت

[illegible] مشین سے [illegible] ایک [illegible] مشین [illegible] ہونے پر متوقع ردِعمل [illegible]

[illegible] مگر اس کی بات میں [illegible]

[illegible] نہیں تھا۔ میں تو [illegible]

[illegible] ایک مشین کی طرح

[illegible] تب ہی میں نے خود

[illegible] میری ماں نے شاید میری

[illegible] فرض کر جرم کی [illegible] بات کیا تھی؟

[illegible] اندر [illegible] والی

[illegible] وحشت تھی۔

مجھے [illegible]

[illegible] اپنے آپ سے مجھے

[illegible] کی ساری [illegible]

[illegible] زندہ تھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] وار تھی

کبھی کبھی اپنا تماشا آپ [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک عام سی وحشت [illegible]

[illegible] کی طرف [illegible]

میں [illegible] کمرے میں بھاگ [illegible]

شاید زندگی کی کوئی ایسی رات تھی جو میں نے آصف کی [illegible] گزاری ہو۔

مگر خواہش کے باوجود کوشش [illegible]

دل میری روح پر [illegible] رات [illegible]

اندھیاروں میں دھکیل دیتی۔

ان دنوں میں صرف [illegible] تھے [illegible]

[illegible] تب [illegible]

الجھن [illegible] اس بات [illegible]

[illegible]

اس نے تین بار [illegible]

[illegible]

[illegible]

شاید [illegible] محبت ہو گئی تھی

شاید!!

HBC
urdufans.com

[illegible]

"BE NORMAL [illegible]"

[illegible]

HBC
urdufans.com

[illegible]

"[illegible] CHANGE [illegible]"

[illegible] CHANGE [illegible]

[illegible]

[illegible]

ARSENAL boss Arsene Wenger is on a collision course with England over Jack Wilshere

urdufans.com

میرے نزدیک زندگی کی حیثیت کھلونے سے [illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] نے مجھے [illegible] تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے [illegible]
[illegible] شراب میری زندگی کا جزو [illegible] دی۔ میں نے [illegible]
[illegible] شراب میں غرق کر لیا تھا۔

اپنی [illegible] میں میں نے اس طرح [illegible] تھا [illegible] قدرت بھی شاید
[illegible] آزما چکی تھی۔ اس روز جب میں [illegible] پاس پہنچی تو اس
نے مجھے [illegible] میں ایک خط [illegible]
[illegible] نے حسب سابق اس کی [illegible] اڑا دیا لیکن
[illegible] تھا۔

"میڈم آپ [illegible] پڑی ہوئی ہیں۔ خدا کے لئے اپنے آپ
[illegible] آپ کے [illegible] شراب ترک کرنے کے لئے [illegible]
آپ نے [illegible]"

اس نے بات [illegible] طرف کر لیا۔

میں [illegible] آ گئی۔ اس سے پہلے [illegible]
[illegible] اس کی نصیحت [illegible]
[illegible]

ایک [illegible] کے سامنے میں [illegible]
[illegible] میں ابھی [illegible] تھی [illegible]
[illegible]

"ہوں"

[illegible] کسی نے [illegible] تم [illegible]
[illegible] صاحب نے مجھے
[illegible] مجھے [illegible]
[illegible]

[illegible]

پیالے سے بھی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] رہی تھی۔

"[illegible] اب [illegible]"

کسی [illegible] قوت نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے [illegible] آہستہ آہستہ اپنے جسم سے [illegible] ہونے لگی۔ خدا نے مجھ
میں [illegible] اتنی طاقت آ گئی کہ میں [illegible] اس کی طرف [illegible] مضبوطی سے [illegible]
اپنے پاؤں زمین میں گاڑ [illegible] ایک [illegible] کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

"[illegible] کہاں [illegible] تھیں تم [illegible] تم نے یہ کیا کیا [illegible] تم نے تو مجھے مار ڈالا
[illegible] کیوں [illegible] نہیں؟"

HBC
urdufans.com

وہ خود آیا [illegible] رہا۔ میں پتھر کی طرح ساکت رہی۔ اسے [illegible] جواب [illegible]
میری تو قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ سوائے بصارت کے اور تمام حسیات [illegible]
تھیں۔ میں اسے پاگلوں کی طرح دیکھتی رہی۔

"آصف تم"

میں نے پوری قوت صرف کر کے اپنی [illegible] ہونٹوں کو ہلا دیا۔

"[illegible] شکر ہے۔ میرا [illegible] درد ہو گیا"

اس کے لہجے میں اب کرب کے ساتھ [illegible] بھی [illegible] آ گئی تھی۔ میں اسے دیکھے جا رہی [illegible] میں نے اسے [illegible]

میں نے [illegible] پایا جیسے زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی۔

اچانک کسی نے میرا انگوٹھا [illegible] پکڑ [illegible] میں تقریباً غش کھانے کی کیفیت میں آ گئی تھی۔ [illegible] کی طرف بڑھا [illegible] میں [illegible] بھول گئی۔ [illegible] کے [illegible] تک کا فاصلہ [illegible] میرے [illegible] میرا [illegible] بھی اپنے ساتھ [illegible] اسے اجازت نہ دیتی۔

آصف یہاں انجینئرنگ کی اعلیٰ [illegible] حاصل کرنے حکومت کے وظیفے پر آیا تھا۔ آصف سے محبت بہت پہلے [illegible] تھی لیکن میرے پاس اس کی بات [illegible] جواب نہیں تھا۔ میں اس سے [illegible] اسے کیا [illegible] مجھ پر جھکے ہی تو [illegible] تھی۔

میں [illegible] عورت تھی [illegible] اپنے جسم [illegible] نہیں [illegible] کرتے۔
"[illegible] شدت [illegible] لڑنا [illegible]
[illegible] ساتھ [illegible] اب"

[illegible]

"[illegible]

[illegible] انوں گی۔"

اس نے [illegible]

[illegible] کہ میں [illegible] حالات کے [illegible] بہرگز نہیں [illegible]

"تم [illegible] ہے۔ میں [illegible] بھول جاؤ۔ [illegible] بھی تو جاتے ہیں۔ [illegible] سمجھا ہوں [illegible] کوئی ایسی [illegible]"

وہ میری [illegible]

ماما تب بھی چپ رہیں۔ [illegible] پاپا [illegible] ایک [illegible] بہرحال زندہ [illegible] ہے۔

لیکن [illegible] کا [illegible] نے [illegible]

"[illegible]"

ڈاکٹر نے مجھے [illegible] آصف [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] میری سیکرٹری [illegible]

[illegible] تصدیق نہیں ہوئی

[illegible]

urdu[illegible].com

[illegible]

[illegible]

"جیسا آپ کا حکم میڈم"

[illegible]

urdu...s.com

[illegible]

[illegible]

urdufans.com

HBC
urdufans.com

"میری [illegible] بات سے آپ [illegible] مجھے [illegible]"
[illegible]

[illegible] بھی [illegible]
لیکن اس نے [illegible] مجھے [illegible] بھی آتی ہے۔
[illegible]
[illegible] میرا ادب [illegible]

"[illegible] بچے کی لاش ہے [illegible]"

[illegible]

[illegible]

میں نے اس کی آنکھوں میں [illegible]

"[illegible]"

[illegible]

"[illegible]" ..

میں نے [illegible] مطمئن [illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] نہیں [illegible] ..
[illegible] ہے۔

"[illegible]"

میں نے ایک [illegible] سے بھی [illegible]

[illegible]
[illegible]

"[illegible]"

[illegible]
[illegible]
[illegible]
آخری لمحات میں اس [illegible] سے لپٹ گئے تھے۔

[illegible] لیکن شہنشاہ [illegible]
[illegible]
[illegible] شہنشاہ [illegible]

[illegible] ندامت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

ابھی مجھے [illegible]
اپنے [illegible] ایک بھرپور [illegible]
[illegible]
[illegible] خوشی [illegible] باقی ہے [illegible]

HBC
urdufans.com

HBG
urdufans.com

بیس کیمپ (ناول)

طارق اسماعیل ساگر

[illegible]

قیمت 150 روپے

ساگر پبلشرز

[illegible]

فون: 7230423

www.sagar.com.pk

اور حصار ٹوٹ گیا (ناول)

طارق اسماعیل ساگر

[illegible]

قیمت 170 روپے

ساگر پبلشرز

[illegible]

فون: 7230423

www.sagar.com.pk

HBC
urdufans.com

تجسس، تحیر اور خوف سے جنم لینے والی ایک ناقابل فراموش داستان
جادوگری کے اسرار و رموز کا یادگار شاہکار
ایک نہ چھوٹنے والی کہانی

صنم کا تابوت

ایم اے راحت

قیمت -/250

ساگر پبلشرز
7-8 ڈونر مال داتا دربار روڈ لاہور
042-7230423

مذہبی سیاست کے تضادات

تحلیل و تجزیہ

ساگر پبلشرز
فون: 7230423
www.sagar.com.pk

urdufans.com

پورا سچ

[illegible]

...953 [illegible]